اپریل 2009

قیمت : -/10 روپے

ماہ نامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

22،23،24 فروری 2009 کو قومی اردو کونسل اور رحمانی فاؤنڈیشن مونگیر کے اشتراک سے "جنگ آزادی کی تحریکات: ابتدا سے انیسویں صدی تک" کے موضوع پر ایک کل ہند سہ روزہ سیمینار کا انعقاد عمل میں آیا۔ سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں دائیں سے بائیں: ڈاکٹر ابوبکر عباد، پرنسپل پبلیکیشن آفیسر قومی اردو کونسل، مولانا ولی رحمانی، ڈاکٹر علی جاوید اور پروفیسر لطف الرحمن۔

کانفرنس میں شریک ہونے والے بیرونی مندوبین اور معزز مقامی شخصیتیں۔

ماہ نامہ

اردو دنیا نئی دہلی

جلد۔11، شمارہ۔4، اپریل 2009

مدیر: ڈاکٹر ابوبکر عباد

اعزازی مدیر: مخمور سعیدی

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

کمپوزنگ: شہناز اختر

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا،
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک۔1، ونگ-6
آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی- 066 110
فون: 26103381, 26103938
فیکس: 26108159, 26179657
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: urduduniyancpul@yahoo.co.in
urducouncil@gmail.com

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746, 26169416

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس،
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002
فون: 040 - 24415194

اس شمارے میں

آپ کی بات .... قارئین کے خطوط 2
ہماری بات .... ادارہ 4

زبان اور تعلیم
● فاصلاتی تعلیم: ادھورے خوابوں کی تعبیر کا وسیلہ .... امام اعظم 5
● اردو اور ہندی کے باہمی رشتے .... محمد جمال مصطفےٰ 7

ادب
● سدیپ بنرجی: ہندی کویتا کا منفرد شاعر .... صادق 10
● پریم چند اور آریہ سماج .... پردیپ جین 13
● غالب کا ایک متنازعہ خط .... ابرار رحمانی 16
● خلیل الرحمن اعظمی اور نوائے ظفر .... سرور الہدیٰ 22
● حلقۂ ارباب ذوق کے ادبی وانتقادی تصورات .... شاہد پٹھان 27
● موجِ گل، موجِ صبا، سب خاموش .... فیاض رفعت 31
● لکھنؤ کی تین شخصیتیں .... ملک زادہ جاوید 33

سائنس ٹیکنالوجی اور ماحولیات
● کمیونٹی ریڈیو .... ارشاد عالم 36
● ماحول کی آلودگی اور ہماری ذمے داریاں .... فرزانہ اسد 40

ہماری مطبوعات سے
● نئے شعری رجحانات .... خلیل الرحمن اعظمی 42
● ہند اسلامی تہذیب کے ایرانی اور زرتشتی عناصر .... کبیر احمد جائسی 47

اردو خبر نامہ .... ادارہ 51

تبصرہ وتعارف 67
● کلیات راجندر سنگھ بیدی .... مخمور سعیدی
● مقدمۂ کلام آتش .... فیاض احمد وجیہہ
● ہند ایرانی ادبیات .... احمد کفیل
● زندگی کا علمی سفر .... ابوبکر عباد
● اردو ادب کے تین بھائی .... سید امتیاز الدین
● بحث ومباحثہ — جلد-1، شمارہ-4 .... خلیق انجم
● گیسوئے تنقید .... فیروز عالم
● تانیثیت کے مباحث اور اردو ناول .... مشرف علی

بچوں کا گوشہ
● ہندوستان کی پہلی خاتون ڈاکٹر .... محمد سراج عظیم 75

آپ کی بات

■ **افتخار عارف، صدر نشین مقتدرہ قومی زبان، ایچ 4/8، پطرس بخاری روڈ، اسلام آباد۔ پاکستان**

آپ کی زیرادارت شائع ہونے والا ماہنامہ ''اردو دنیا'' ملا۔ کرم فرمائی کا شکرگزار ہوں۔ انشاء اللہ میں بھی پڑھوں گا اور دیگر احباب اور رفقا بھی فیض یاب ہوں گے۔

■ **ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی، G-49 تھرڈ فلور، شاہین باغ، نئی دہلی**

''اردو دنیا'' کا مارچ 2009 کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ اس شمارے میں ''اردو زبان کے مسائل اور حل''، ''ہندوستانی یونیورسٹیوں میں اردو ریسرچ''، ''اردو ہے جس کا نام'' اور ''سائنس اور انسانی زندگی'' اچھے، معلوماتی اور بصیرت افروز مضامین ہیں۔ ان مضامین سے میرے محدود علم میں اضافہ ہوا ہے۔ ایسے گراں قدر اور مفید مضامین کی اشاعت پر آنجناب اور فاضل مضمون نگار قابل صد تہنیت ہیں۔

''روبرو'' کے تحت گفتگو میں لسانیات کے نامور ماہر پروفیسر خلیل احمد بیگ کے لکھے ہوئے فاضلانہ اور سیر حاصل ارشادات سے مستفید ہوا۔ جمیل مظہری کی مثنوی کی خوبیاں بغیر شریعت اور سجدوں سے متعلق کچھ کہے بھی بیان کی جاسکتی تھیں۔

■ **پی محمد جمیل، مسجد گلی، 11/623، ضلع وانم باڑی- 635751**

''اردو دنیا'' مارچ 2009 میں ''اپنی بات'' جامع اور پر اثر ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت اور ان کی حیات و خدمات ایک قابل تقلید نمونہ پیش کرتی ہیں۔ مضامین میں ''اردو زبان: مسائل اور حل'' امام اعظم صاحب، ''ہندوستانی یونیورسٹیوں میں اردو ریسرچ'' خوشحال زیدی صاحب اور ''اردو ہے جس کا نام'' سلمان غازی صاحب کے مضامین علمی اور معلوماتی ہیں اور مبارک باد کے مستحق ہیں۔ ویسے بھی مضامین اچھے اور فکر انگیز ہیں اور پڑھنے والوں کے لیے خاصا مواد فراہم کرتے ہیں۔

■ **رشید قاسمی، نزد بوہرہ مسجد، شیواجی نگر، جلگاؤں (مہاراشٹر)**

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام ممبئی میں کل ہند کتاب میلے کا انعقاد عمل میں آیا تھا۔ اس کتاب میلے میں قومی اردو کونسل کا اسٹال حسب معمول حاضرین کی توجہ کھینچنے میں کامیاب رہا۔ اردو میں ہر موضوع پر ہزاروں کتابیں، کتابوں کی پرکشش سجاوٹ، متعدد اسٹاف، سبھی کچھ دامن دل کھینچنے والا تھا۔ پھر کتابوں پر بھرپور رعایت، قومی اردو کونسل کے اسٹال کے بعد ناظرین اور خریداروں کی بہار ''کتاب دار'' بک اسٹال پر دیکھی۔ میلے میں شرکت کر کے یوں لگا جیسے اردو کی ایک دنیا بسی ہے جس میں گھومنے پھرنے کی مسرت ناقابل بیان ہے۔ ہر چند کہ سوا کروڑ آبادی پر مشتمل ممبئی جیسے مہانگر میں، پورے نو دن بھیڑ نہیں جٹی لیکن اخباری اطلاعات کے مطابق 35 لاکھ روپے کی کتابوں کی فروخت بھی کچھ کم نہیں۔ اگر دیگر پبلشر بھی مزید رعایتوں کا اعلان کرتے تو اچھی خاصی کتابیں فروخت ہوسکتی تھیں۔ اور اس مقصد کے تحت، ممبئی میں ہر برس یا دوسرے برس اردو کتاب میلے کا انعقاد ضروری ہے۔

حیرت اس بات پر ہے کہ دو مہینے قبل، اردو کتاب میلے کا اعلان مشتہر ہو چکا تھا۔ مہاراشٹر اور پڑوسی ریاست مدھیہ پردیش کے تعلیمی اداروں کے ذمے داران اگر چاہتے تو اپنی لائبریریوں کے لیے، کتابوں کی خریداری کی منصوبہ بندی کر سکتے تھے۔ (کچھ اداروں نے ایسا کیا بھی) لیکن مشکل یہی ہے کہ اردو والوں میں بے حسی کا دور دورہ ہے۔ روزانہ سیکڑوں روپئے چائے پان پر اڑا دینے والے اہل اردو سو، دو سو روپئے سالانہ قیمت والے رسائل خریدنے سے کتراتے ہیں۔ دنیا جہان کی معمولات سے بھرے اخبارات پر ماہانہ سو، سوا سو روپئے خرچ کرنے سے قاصر ہیں۔ ٹی وی کے لیے کیبل پر ماہانہ ڈیڑھ دو سو کو ہاتھ کا میل سمجھنے والے بچوں کا ایک رسالہ خریدنے میں آنا کانی کرتے ہیں۔ جبکہ مراٹھی، گجراتی، تمل اور تیلگو زبانوں کے چاہنے والے اپنے علاقائی اخبارات کا سرکولیشن دس اور بیس لاکھ تک پہنچا دیتے ہیں۔ اس برس کل ہند مراٹھی ساہتیہ سمیلن، مہاراشٹر اور گوا میں منعقد ہونے کی بجائے امریکا میں ہونے جارہا ہے جبکہ سارے جہاں میں دھوم والی اردو زبان کا ضلعی ادبی کنونشن بھی افراتفری کا شکار ہوجاتا ہے۔ خدا کرے، اہل اردو خواب غفلت سے جاگیں اور اردو کے مستقبل کو خوش گوار بنانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔

مارچ کے شمارے میں اردو کتاب میلہ کے تعلق سے تصاویر دلچسپ ہیں اور رپورتاژ دل پذیر۔ مبارکباد قبول کیجیے۔

■ **مدحت لقمان، اے ڈی اے کالونی، نیم سرائے، الٰہ آباد- 110112**

آپ نے لکھا اردو زبان کے فروغ کی ضرورت کو جذباتی چشمے سے نہیں دیکھنا چاہیے۔ بلکہ اس کی ضرورت کو دلائل کے ساتھ ثابت کرنا چاہیے، اردو کے فروغ کے لیے مندرجۂ ذیل نکات قابل غور ہیں:

1. اردو پڑھنے اور لکھنے میں مزید آسانیاں پیدا کرنا
2. مضامین ایسے لکھے جائیں جو ہر ذہنی سطح کے لوگوں کے لیے بہترین مواد فراہم کریں۔

3. دوسری زبانوں میں جس قسم کے مضامین مقبول ہوتے ہیں ان کو اردو اپنے انداز میں اپنائے۔
4. دوسری زبان والے یہ محسوس کریں کہ اردو والے ان کی زبان کی بھی عزت کرتے ہیں۔
5. تلفظ کی حفاظت کی جائے۔
6. سیاسی سطح پر اردو کی حمایت کرنے والوں میں اضافے کی بھرپور کوشش کی جائے۔
7. جہاں جہاں ممکن ہو اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے پر زور دیا جائے۔
8. کتابیں طباعت کے اعتبار سے معیاری علم اور دلکش ہوں۔

کہنا آسان کرنا مشکل ہے۔ اس کہاوت کو ایک چیلنج کی طرح لینا چاہیے۔ جب ارادے پختہ ہو جائیں، راہیں خود بخود نکل آتی ہیں۔

■ **شمیم الحق، حق ہاؤس، پوکریا، پوسٹ ضلع، بیگوسرائی-851101 (بہار)**

شہرۂ آفاق انگریزی ناول نگار پرل ایس بک، کی ایک عادت تھی کہ بچوں کی سالگرہ پر کوئی معمولی سا تحفہ دیا کرتی تھیں۔ لیکن ان تحفوں کے ساتھ ایک غیر معمولی مختصری عبارت بھی ہوا کرتی تھی۔ ایک چھوٹی سی بچی کو کان کی بالی کے ساتھ یہ تحریر دی تھی:

''ان ہاتھوں کی تعظیم و تکریم کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ان کو پہنو، جن کی فنکاری اور صناعی نے ان بالیوں کو حسن بخشا ہے''

فروری 2009 کے ''اردو دنیا'' کے سرورق کو دیکھ کر یہ جملہ بے اختیار ذہن کے نہاں خانے سے نکل کر نوک قلم پر آ گیا۔ گہرے بادامی رنگ کی سطح پر زعفرانی رنگ کے حاشیے اور ان میں دلکش اور دیدہ زیب نقش و نگار نے جس شکل جمیل کی تشکیل کی ہے، اس کی تعریف کا تعلق الفاظ سے زیادہ الہامی ادراک فن سے ہے۔ ''اردو دنیا'' گہرے عنابی رنگ اور سفید گوٹے کے حاشیے سے خود اپنے آپ میں مکمل فنکاری کا نمونہ ہے۔ اس نامعلوم فنکار کو میرا سلام، جس کے موئے قلم کی جنبش نے سادگی و پرکاری سے اس حسین شاہکار کو جنم دیا۔

■ **عشرت امروہوی، غزنوی مارگ، مرزاپور، احمد آباد-380001**

ماہنامہ ''اردو دنیا'' کے فروری 2009 کے شمارے میں وارث علوی صاحب کا مضمون ''عادل منصوری کی شاعری پر ایک نظر'' پڑھا۔ انھوں نے بات تو شروع کی عادل منصوری کی شاعری پر مگر ان کا focus جناب محمد علوی پر رہا۔ انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کے علاوہ گجرات میں اس زمانے میں کوئی شاعر تھا ہی نہیں؟

مضمون کے شروع میں وارث علوی صاحب نے محمد علوی صاحب کی life style کا ذکر کرتے ہوئے ان کی کلب اور جم خانہ کی زندگی گنجیفے بازی وغیرہ کا ذکر ایسے کیا ہے گویا وہ بڑے ثواب کا کام کر رہے تھے۔ عادل منصوری کے تعلق سے منصوری طبقے کے لوگوں کے بارے میں وارث صاحب نے لکھا ہے کہ یہ لوگ ''تبلیغی جماعت کے تعلق کی وجہ سے بہت مذہبی بھی ہو گئے ہیں۔ وارث صاحب مجاوروں کے خاندان سے ہیں جن کا کام بہ قول ظ.انصاری مرحوم ''تعویز گنڈے بنانا ہے اور تبلیغی جماعت کے لوگ اندھی عقیدت کے خلاف ہیں۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ موضوع سے ہٹ کر لکھنا، بولنا اور اس میں اختلافی مسائل پیدا کرنا وارث صاحب کا محبوب مشغلہ رہا ہے۔'' عادل منصوری کے مضمون میں بھی آپ نے ایسا ہی کیا ہے۔

■ **پروفیسر محمد علی اثر، ''کاشانۂ اثر'' محبوب چوک، حیدرآباد-500002**

راقم الحروف ''دکنی اردو کی کتابیات'' کے عنوان سے 1983 تا حال شائع ہونے والی کتابوں کی توضیحی فہرست شائع کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں متعلقہ موضوع پر مطبوعہ تمام کتابوں کے مصنفین/مرتبین/مؤلفین سے خواہش کی جاتی ہے کہ وہ اپنی کتاب کا ایک نسخہ یا ابتدائی چار پانچ صفحات کا زیراکس جس میں صفحات کی تعداد ناشر کا نام اور پتہ، سال اشاعت، سائز، قیمت، ایڈیشن، تعداد اشاعت کی صراحت شامل ہو، ارسال کریں۔

شعر، غیر شعر اور نثر

مصنف: شمس الرحمٰن فاروقی

جناب شمس الرحمٰن فاروقی کے خیال انگیز مضامین کا یہ مجموعہ پہلی بار 1973 اور دوسری بار 1998 میں شائع ہوا تھا۔ اس میں شامل مضامین نے تفہیم شعر و ادب کی نئی راہیں کھولیں۔ یہ اس اہم کتاب کا تازہ ترین ایڈیشن ہے جس میں ''پس نوشت: آج یہ کتاب'' کے عنوان سے ایک نئے مضمون کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے۔ جدید ادب اور جدیدیت کی تفہیم نیز کلاسیکی ادب کی فہم و بازیافت دونوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

ڈیمائی سائز، صفحات: 528، قیمت-/228 روپے

ہماری بات

اردو شاید ہندوستان کی واحد زبان ہے جس نے دھیرے دھیرے ان علاقائی سرحدوں کو عبور کر کے جن میں اس نے جنم لیا تھا اور جہاں اس کی ابتدائی نشو ونما ہوئی تھی، پورے ملک میں رسائی حاصل کی اور ہر جگہ مضبوطی سے اپنے قدم جما لیے۔ اردو کے پھیلاؤ اور اس کے تدریجی فروغ کا یہ عمل صدیوں پہلے اسی زمانے سے شروع ہو گیا تھا جب اس نے جنم لیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے عناصر ترکیبی میں ان تمام زبانوں کے کچھ نہ کچھ اثرات شامل تھے جو ہندوستان میں مروج رہی تھیں۔ کھڑی بولی کو اس کا منبع قرار دیا جاتا ہے، لیکن اس میں اودھی، برج بھاشا وغیرہ شروع ہی سے دخیل رہی ہیں، بعد میں پنجابی اور مراٹھی اور کچھ دوسری زبانوں کے اثرات بھی اس میں درآئے۔ اس طرح یہ بیشتر ہندوستانی زبانوں سے مستفیض ہوتی رہی ہے۔ عربوں، ایرانیوں اور ترکوں کی ہندوستان میں آمد کے بعد سے اس نے ان کی زبانوں پر بھی اپنے دروازے کھلے رکھے۔ صرف ان زبانوں سے ہی نہیں ان کے ادبی اور شعری خزانوں سے بھی اس نے استفادہ کیا اور اپنے لیے نثر و نظم کی بیشتر اصناف وہیں سے حاصل کیں۔ آگے چل کر جب ہندوستان میں انگریزی زبان کا دور دورہ ہوا تو اس کے باوجود کہ وہ سراسر ایک اجنبی زبان تھی، اردو نے اس کے ساتھ بھی بے اعتنائی کا رویہ اختیار نہیں کیا اور انگریزی الفاظ کے ساتھ ساتھ اس زبان کے شعری اور نثری اسالیب کو بھی بخوشی قبول کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اب اس کے پاس مختلف اسالیب اظہار کا ایک بیش بہا خزانہ موجود ہے۔

اردو اپنی سرشت میں ایک سیکولر زبان ہے، ابتدا ہی سے یہ سبھی مذہبوں اور مسلکوں کے ماننے والوں کا وسیلۂ اظہار رہی ہے۔ ہر مذہب و ملت کے لوگ یہ زبان بولتے بھی رہے ہیں اور اس میں لکھنے پڑھنے کا کام بھی کرتے رہے ہیں۔ اس میں اگر قرآن مجید کے ترجمے ہوئے ہیں تو شریمد بھگوت گیتا اور گورو گرنتھ صاحب کے تراجم سے بھی اس کا دامن خالی نہیں۔ جینی، بودھ اور دوسرے فرقے بھی اس سے اپنے خیالات و نظریات کی تبلیغ و اشاعت کا کام لیتے رہے ہیں لیکن اس کا اپنا مزاج غیر فرقہ وارانہ ہے جس کی اساس انسان دوستی پر ہے۔ اردو کے قلمکاروں کی اکثریت جن میں شاعر اور ادیب دونوں شامل ہیں، انسانی اخوت و محبت کی نقیب رہی ہے اور اس نے نفرت و کدورت کے میلانات کو سختی سے رد کیا ہے۔

اردو ہندوستان کی جنگ آزادی کی علم بردار بھی رہی ہے۔ آزادی کی لڑائی میں اردو صحافت نے جو موثر کردار ادا کیا ہے، اس کا اعتراف ان لوگوں کو بھی ہے جنھوں نے آزادی کے بعد تقسیم ملک کی ذمے داری اس پر ڈالنے کی کوشش کی۔ مقام شکر ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ غلط فہمی جس نے بہت سے ذہنوں میں جگہ بنالی تھی دور ہوتی جارہی ہے اور وہ اسباب واضح ہوتے جارہے ہیں جو اس کے پیچھے کام کر رہے تھے۔

اردو اب ایک بین الاقوامی زبان بن چکی ہے۔ ہندوستان اور پاکستان تو اس کے اپنے علاقے ہیں ہی لیکن اب امریکہ، کناڈا، برطانیہ، جرمنی، جاپان، اسکینڈی نیوین ممالک، سابق سوویت یونین کے کچھ علاقے، خلیجی ریاستیں اور سعودی عرب وغیرہ ایسے جغرافیائی خطے ہیں جہاں اردو ایک باثر زبان کی حیثیت سے موجود ہے۔ یہ صورت حال اردو اور اردو کے خیرخواہوں کے لیے خاصی حوصلہ افزا ہے لیکن اس حوصلہ افزا صورت حال میں بھی ایک سوال غور طلب ضرور ہے: کیا ہمیں اس صورت حال پر جو ایسے عوامل کی پیدا کردہ ہے جن میں ہماری ذرا بھی حصہ داری نہیں، مطمئن ہو کر بیٹھ جانا چاہیے اور اپنی زبان کی توسیع و ترقی کی کوششوں کی طرف سے بے توجہی کو اپنا شعار بنائے رکھنا چاہیے؟

پچھلے تیس چالیس سال میں ہندوستان کی مرکزی اور صوبائی حکومتوں نے اردو کو بہت سی سہولتیں دی ہیں۔ ان سہولتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم نے اردو کی بہتری کے لیے کوئی مثبت لائحۂ عمل مرتب کیا یا نہیں؟ اور کیا ہم نے کبھی یہ سوچا کہ حکومتوں کی طرف سے دی جانے والی سہولتوں اور رعایتوں سے قطع نظر اپنی زبان کے تئیں خود ہمارا کیا فرض ہے، کیا ذمے داریاں ہیں؟ ان ذمے داریوں کو سمجھے بغیر اور ان کے تقاضوں کو پورا کیے بغیر، اپنی زبان کے تئیں اپنے فرض سے ہم سبک دوش نہیں ہو سکتے۔

بعض دیگر امور سے قطع نظر بنیادی مسئلہ نئی نسلوں کو اردو پڑھانے کا ہے۔ جن سرکاری، نیم سرکاری یا غیر سرکاری اسکولوں میں اردو پڑھانے کا نظم ہے وہاں اپنے بچوں کو اردو ضرور پڑھوائیے۔ جہاں اردو نہیں پڑھائی جاتی وہاں کوشش کیجیے کہ اردو کی پڑھائی شروع ہو، یہ کوشش اجتماعی اور انفرادی دونوں سطحوں پر کی جائے تو جلد یا بہ دیر ضرور کامیاب ہوگی لیکن اس امید میں وقت ضائع نہ کیجیے اور اپنے بچوں کو گھروں پر اردو پڑھائیے۔ یہ اپنی لسانی شناخت کی بقا کا بھی مسئلہ ہے اور اس گنگا جمنی، تہذیبی، ثقافتی روایت کو آگے بڑھانے کا بھی جس نے پچھلے ایک ہزار سال میں برصغیر کی متمدن زندگی کے خاکوں میں خوشگوار رنگ آمیزی کی ہے۔

□□□

امام اعظم

فاصلاتی تعلیم: ادھورے خوابوں کی تعبیر کا وسیلہ

موجودہ دور میں زندگی کے ہر شعبے میں تیزی سے ترقی و تبدیلی ہو رہی ہے اور ان بدلتے ہوئے حالات میں خود کو ایڈجسٹ کرنے اور اپنی جگہ بنانے کی دوڑ میں شامل ہونے کے لیے ہر شخص کوشاں ہے۔ اس کے نتیجے میں تعلیم وقت کی اہم ترین ضرورت بن کر ابھری ہے، لیکن بعض بنیادی سہولتوں کا فقدان اور زندگی کی الجھنیں باضابطہ یا روایتی تعلیم کی تکمیل میں آڑے آتی ہیں۔ بہتوں کے خواب پورے نہیں ہوتے اور ترجیحات بدل جاتی ہیں۔ خاندانی ذمے داریوں کے بوجھ سے بہتیرے بے بس ہو جاتے ہیں کہ باضابطہ روایتی تعلیم کے لیے درکار وقت نکالنا اور تعلیمی نظام کی گرانی جھیلنا ان کی بساط سے باہر ہو جاتا ہے۔

ایسے لوگوں کی خیر خواہی میں شعبۂ تعلیم بھی فعال ہوا ہے اور گھر رہ کر کفایت کے ساتھ حصول تعلیم کا نظام وضع کر لیا گیا ہے جسے فاصلاتی تعلیم کہتے ہیں۔ اس نظام نے تعلیم نہ حاصل کر کے ترقی کی دوڑ میں پچھڑ جانے کا قلق دور کرنے اور ادھورے خواب پورے کرنے کے مواقع فراہم کر دیے ہیں۔ آج دنیا کی آبادی کا ایک قابل لحاظ حصہ فاصلاتی نظام تعلیم سے استفادہ کر رہا ہے۔ ہمارے ملک میں بھی اس نظام کا نیٹ ورک تیزی سے پھیل رہا ہے۔ ثانوی سطح سے اعلیٰ تعلیم حتیٰ کہ پیشہ ورانہ تربیت اور تکنیکی تعلیم تک کی سہولتیں نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اوپن اسکولنگ اور دسیوں قومی اور ریاستی یونیورسٹیاں فاصلاتی نظام تعلیم کے تحت فراہم کرتی ہیں۔ ان میں این.آئی.او.ایس، اگنو یعنی اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی اور مانو یعنی مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا نیٹ ورک سب سے وسیع ہے۔

فاصلاتی نظام تعلیم روایتی یا باضابطہ تعلیمی نظام کا نعم البدل ہے، مگر اس کے داخلے کا نظام، طریقۂ تدریس، ضابطۂ نصاب، امتحان اور تعین صلاحیت کا نظام، روایتی نظام تعلیم سے جداگانہ ہے۔ اس نظام کے تحت اسکول یا یونیورسٹی کیمپس سے الگ رہ کر اپنے گھر میں مصروفیات زندگی سے فراغت کے وقت اپنے طور پر حسب سہولت تعلیم حاصل کرنے کی سہولت ہے۔ داخلے کے بعد مطالعے کے لیے کتابیں گھر بھیج دی جاتی ہیں۔ یہ کتابیں روایتی تعلیم کی نصابی کتابوں کے برعکس مختصر اور جامع ہوتی ہیں۔ یہ وقت کے تقاضوں سے مسابقت رکھنے والے موضوعات پر مبنی اور موضوعات کی سمجھ اور دلچسپی پیدا کرنے والے اسلوب میں تیار کی جاتی ہیں۔ یہ بنیادی تعلیم سے آشنا اور اپنی صلاحیت کو بروئے کار لانے کی لگن رکھنے والوں کے لیے کسی استاد کی مدد کے بغیر تعلیمی فروغ میں معاون ہوتی ہیں۔ طلبہ کو نصاب سے سوالات دے کر مفوضہ کام گھر بیٹھے کرا کر مضامین فہمی کی جانچ کا پہلا مرحلہ طے کیا جاتا ہے۔ اس مرحلے سے گزرنے میں جو دقتیں طالب علموں کو پیش آتی ہیں ان کا ازالہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے نشریات، متعدد ٹیلی مواصلاتی آلات مثلاً ٹیپ ریکارڈ، ویڈیو فلم، ویڈیو کانفرنسنگ، سی.ڈی، کمپیوٹر، انٹرنیٹ ویب سائٹس کے ذریعے مطلوبہ مواد کی ترسیل سے کیا جاتا ہے۔ فاصلاتی نظام تعلیم چلانے والے تقریباً تمام ادارے مختلف چینلوں سے تعلیمی مواد فراہم کراتے ہیں اور مقامی سطح پر اسٹڈی سنٹر قائم کر کے کاؤنسلنگ کا اہتمام بھی کرتے ہیں تاکہ طالب علم حسب ضرورت اسٹڈی سنٹر جا کر کاؤنسلرس کی مدد سے اپنی مشکلات دور کر سکیں۔ علاوہ ازیں ISRO کی سرپرستی میں ایجوکیشنل سٹلائٹ (EDUSAT) کام کر رہا ہے جو تعلیمی مواد کی فراہمی کے لیے مکمل طور پر وقف چینل ہے۔ اس سے استفادے کے دروازے سب کے لیے کھلے ہیں۔ اس طرح درسگاہی ڈھانچے کے ضوابط کی جکڑ بندیوں سے بے نیاز کر کے انفرادی صلاحیت اور علمی جوہر کو ابھارنے کے جدید ترین تکنیکی وسیلے مہیا کرائے جاتے ہیں اور ان وسائل سے حسب سہولت استفادہ کرنے کی پوری گنجائش ہوتی ہے۔ اس لیے باضابطہ درسگاہی تعلیم حاصل نہ کر پانے والے افراد بڑے ذوق و شوق سے اس نظام کے تحت تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ بعض گھرانے فاصلاتی تعلیم کا از خود کیمپس بن گئے ہیں اور یوں یہ نظام، تعلیم بالغاں بالخصوص تعلیم نسواں کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کر رہا ہے۔

فاصلاتی تعلیم کی اسناد کی بنیاد پر لوگوں نے اپنی ملازمت میں ترقیاں بھی پائی ہیں اور مختلف شعبوں میں ملازمت اور روزگار حاصل کرنے میں بھی کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ مقابلہ جاتی امتحانوں یا تخلیقیت کے اظہار میں بھی فاصلاتی تعلیم سے فارغ طلبہ و طالبات نے اچھی پہچان بنائی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ روایتی نظام تعلیم کے مقابلے فاصلاتی نظام تعلیم جو مواد مہیا کرتا ہے وہ سہل، جامع اور اپ ٹو ڈیٹ ہوتا ہے۔ یہ مواد مقابلہ جاتی امتحانوں میں اور تخلیقیت کے جوہر اجاگر کرنے میں بہت معاون ثابت ہوتا ہے۔ پھر اس کے فارغین احساس محرومی کے حصار سے نکل کر تکمیلیت کی تڑپ لے کر ابھرتے ہیں اور نفسیاتی طور پر اس احساس کے ساتھ مقابلہ جاتی امتحانوں میں شریک ہوتے ہیں کہ ان کا مقابلہ روایتی ڈھنگ سے تعلیم حاصل کرنے والوں سے ہے۔ یہ احساس ان میں خود اعتمادی پیدا کرتا ہے اور کامیابی سے ہمکنار کرتا ہے۔

لیکن انتہائی افسوس کی بات ہے کہ ملک کا وہ طبقہ جس میں تعلیمی پسماندگی اور ڈراپ آؤٹس کا تناسب سب سے زیادہ ہے، وہ اس سہل راستے سے بھی اپنی تعلیمی پسماندگی دور کرنے کی خاطر خواہ کوشش کرتا نظر نہیں آتا۔ حالانکہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے ان میں سے بہتوں کی مادری زبان اردو کو ہر طرح کی تعلیم کا میڈیم بنا رکھا ہے اور اپنے نیٹ ورک کو اردو آبادی کے تقریباً ہر بڑے خطے تک پھیلا دیا ہے۔ نیز ڈی ڈی ون اردو چینل پر آدھے آدھے گھنٹے کا ''مانو درشن'' پروگرام سنیچر اور بدھ کو 8 بجے اور 5 بجے شام میں جاری کر دیا ہے۔ باوجود اس کے، اس سے استفادے کا تناسب انتہائی کم ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ابھی تک اردو آبادی کے ایک بڑے حصے میں زمانے کی نبض شناسی کا فقدان ہے اور ان پر سہل پسندی کا بھی غلبہ ہے۔ ایسے کوتاہ بینوں کی بھی کمی نہیں جو فاصلاتی تعلیم کی اہمیت و افادیت کے منکر ہیں۔ اس رجحان کو نجی تعلیمی ادارے چلانے والے مافیا بھی ہوا دیتے ہیں۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ آؤٹ ڈراپس کر جانے والوں اور گھریلو خواتین کے علاوہ مدارس اسلامیہ کے متعلمین اور فارغین بھی اس سے استفادہ کر کے اپنی قابلیت بڑھا سکتے ہیں اور بہتر وسیلۂ روزگار تک رسائی کو سہل بنا سکتے ہیں۔ حال ہی میں مرکزی وزارت فروغ انسانی وسائل کے ماتحت قومی نگراں کمیٹی برائے اقلیتی تعلیم کی مولانا ولی رحمانی کی سربراہی والی ذیلی کمیٹی نے بھی مدارس اسلامیہ کو فاصلاتی نظامِ تعلیم کے مرکزی اداروں سے جوڑنے کی تجویز پیش کی ہے۔ یہ تجویز یقیناً فاصلاتی تعلیم کی افادیت کے پیش نظر ہی آئی ہے۔ اس لیے میرا کہنا ہے:

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے

روایتی اور تکنیکی تعلیم کے وقت اور حالات کے مطابق نشانے پورے کرنے کے جتنے بھی تجربے ہوئے ہیں، فاصلاتی نظامِ تعلیم کا تجربہ ان میں زیادہ کامیاب ثابت ہو رہا ہے۔ خود یہ نظام بھی بتدریج نئے نئے تجربوں کے ذریعے اپنے ہدف کی طرف گامزن ہے کہ خوب سے خوب تر کی جستجو ہی کامیابی و سرفرازی کی ضامن ہوا کرتی ہے۔ ترقی یافتہ قوموں کا موجودہ عروج خوب سے خوب تر کی جستجو ہی کا ثمرہ ہے اور اگر ہمیں بھی ترقی یافتہ بننا ہے جو معقول تعلیم و تربیت کے بغیر ممکن نہیں تو پھر ہم کیوں ادھوری تعلیم پر قناعت کیے بیٹھے ہیں۔ مختصر راستے سے تعلیم پوری کر کے خوب سے خوب تر کی جستجو کریں اور وقت کے تقاضوں پر لبیک کہیں:

چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

□□□

پتہ:
Regional Centre (MANUU)
Darbhanga-846004
(Bihar)

کلیات سراج اورنگ آبادی

مرتب: عبدالقادر سروری

سراج اورنگ آبادی دکن کا وہ آخری بڑا شاعر ہے جس کی شاعری دکن اور شمال کی زبان کے بیچ احساسِ دوئی کو ختم کرتی ہے۔ انھوں نے 24 سال تک کے شعری سفر میں جو کچھ کہا ان میں سے دستیاب شدہ 508 غزلیں، 11 مثنویاں، 9 رباعیاں، ایک قصیدہ، 5 مستزاد، ایک ترجیع بند اور ایک مناجات اس کلیات میں شامل ہیں۔ اردو شعر و ادب میں سراج کی قادرالکلامی مسلم ہے، ان کے کلام کا انتخاب اردو دنیا کی تقریباً تمام درس گاہوں کے نصابات میں شامل ہے۔ اسی غرض سے قومی اردو کونسل نے ''کلیات سراج'' کو نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔

صفحات: 307، قیمت -/96 روپے

ہمارا ای میل آئی ڈی

Email:urduduniyancpul@yahoo.co.in

قومی اردو کونسل اور ماہ نامہ ''اردو دنیا'' اور سہ ماہی ''فکر و تحقیق'' سے خط و کتابت بذریعہ ای میل اب اس پتے پر کریں۔

محمد جمال مصطفیٰ

اردو اور ہندی کے باہمی رشتے

ہندوستان میں دیگر مسائل کے ساتھ ایک اہم مسئلہ اردو زبان کا بھی ہے۔ بار بار یہ سوالات اٹھائے جاتے رہے ہیں کہ اردو کب، کہاں اور کیسے پیدا ہوئی؟ اس کے وجود میں آنے کا سبب کیا ہے؟ کیا اردو، ہندی، ہندوستانی اور کھڑی بولی الگ الگ زبانیں ہیں یا ایک ہی زبان؟ وغیرہ وغیرہ ان سوالوں کے مختلف جوابات بھی سامنے آتے رہتے ہیں۔

اردو اور ہندی دونوں زبانوں کا جائزہ لیا جائے تو دونوں زبانوں میں پائی جانے والی مماثلتیں دنیا کی دوسری زبانوں میں خال خال ہی نظر آئیں گی اس میں کوئی شک نہیں کہ دونوں زبانوں کی اساس، قواعدی ڈھانچہ، ڈول اور کینڈا آپس میں اس قدر مشترک ہیں کہ دونوں کی انفرادی شناخت مشکل ہو جاتی ہے۔ تاریخی اعتبار سے دونوں زبانیں شورسینی اپ بھرنش، بعدازاں مغربی ہندی کی پانچ بولیوں میں سے ایک کھڑی بولی سے ماخوذ ہیں گویا دونوں زبانیں ایک ہی سرچشمے سے پیدا ہوئیں۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ دونوں کا ارتقا الگ الگ سمتوں میں ہوا ہے جس کے نتیجے میں دو اہم لسانی اور ادبی روایتیں وجود میں آگئیں۔ جہاں ایک طرف ہندی سنسکرت سے وہاں دوسری طرف اردو پراکرتوں کے ساتھ ساتھ عربی، فارسی، ترکی سے بھی استفادہ کرتی نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں کے ذخیرۂ الفاظ میں خاصہ فرق نمایاں ہو گیا ہے۔

تاریخی اعتبار سے یہ امر تصدیق شدہ ہے کہ اردو اور ہندی دونوں ہند آریائی زبانیں ہیں۔ ماہرین لسانیات نے ہند آریائی زبانوں کی ترقی کے تین مدارج بتائے ہیں:

1. قدیم ہند آریائی (1500 ق م تا 500 ق م)
2. وسطی ہند آریائی (500 ق م تا 1000)
3. جدید ہند آریائی (1000 تا حال)

قدیم ہند آریائی زمانے میں، جسے سنسکرت کا زمانہ کہا گیا ہے، سنسکرت کی دو شکلیں ویدک سنسکرت اور کلاسیکل سنسکرت ابھرتی ہیں۔ لیکن مذہب کی اجارہ داری سے ویدک سنسکرت اور اونچے طبقوں کی بالادستی سے کلاسیکل سنسکرت کا عوام سے رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ نتیجتاً عوام ایک ایسی عام فہم سادہ اور غیر مصنوعی زبان اپناتے ہیں جسے ماہرین لسانیات نے پراکرت کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس طرح وسطی ہند آریائی کا دور شروع ہوتا ہے۔ وسطی ہند آریائی دور پراکرتوں بعد، ازاں اپ بھرنشوں کے آغاز وارتقا کا عہد ہے جن کے ابتدائی نمونے پالی او راشوک کے کتبات میں نظر آتے ہیں۔ بعد میں جب پراکرتوں نے ادبی رخ اختیار کیا تو عوام کا رخ پھر بدلا اور وہ ایک زبان مختلف اپ بھرنشوں کی شکل میں اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ جو آگے چل کر جدید ہند آریائی زبانوں کی بنیاد بنی۔ جدید ہند آریائی جس کا زمانہ 1000 تا حال محیط ہے۔

جن علاقوں میں اپ بھرنشیں وجود میں آئیں وہاں ان سے قبل پراکرتیں بولی جاتی تھیں۔ اپ بھرنشوں کی تعداد میں گرچہ اختلاف ہے پھر بھی بیشتر ماہرین لسانیات نے پراکرتوں کو بنیاد بنا کر اپ بھرنشوں کی پانچ قسموں شورسینی اپ بھرنش، ماگدھی اپ بھرنش، اردھ ماگدھی اپ بھرنش، مہاراشٹری اپ بھرنش اور براچڈ کیکئی اپ بھرنش پر اتفاق ظاہر کیا ہے۔ شورسینی اپ بھرنش شورسینی پراکرت سے نکلی جس کا مرکز متھرا کا علاقہ ہے۔ اسی کی کوکھ سے مغربی ہندی پیدا ہوئی اور یہی مغربی ہندی اردو اور ہندی دونوں کی ماں ہے۔ مغربی ہندی کسی زبان کا نام نہیں بلکہ ماہر لسانیات گریرسن کی دی ہوئی اصطلاح ہے۔ مغربی ہندی کا اطلاق دہلی اور نواح دہلی اور مغربی یوپی میں بولی جانے والی پانچ بولیوں کھڑی، ہریانی، برج، قنوجی اور بندیلی پر ہے۔ جن میں کھڑی بولی موجودہ ہندی اور اردو کا سرچشمہ ہے۔

علم لسانیات کا اصول ہے کہ جب ایک ہی خاندان کی زبانیں ایک دوسرے سے ملتی ہیں اور اپنے اپنے علاقوں میں عوام کے خیالات کا ذریعۂ اظہار بنتی ہیں تو صوتی، صرفی اور نحوی خصوصیات ایک ہونے کی وجہ سے ان میں ایک خاص قسم کا تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ اردو اور ہندی دونوں کی ابتدائی تاریخ صدیوں تک ایک رہی ہے اس لیے دونوں میں صرفی ونحوی ڈھانچے اور الفاظ ومحاورات کا اشتراک دوسری زبانوں کے مقابلے کہیں زیادہ ہے۔ پروفیسر احتشام حسین کا خیال ہے کہ ”اردو اور ہندی کے بنیادی ڈھانچے میں وحدت ہے صرف اوپری ڈھانچے میں فرق ہے۔“ پنڈت آنند نرائن ملا نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ: ”اردو اور ہندی کی جڑیں ایک ہی ہیں لیکن دونوں کے اسٹائل میں فرق ہے۔“ انھوں نے اپنی بات ایک مثال دے کر اس طرح سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ ”اگر مان سروبر جھیل سے نکلنے کی بنیاد پر گنگا، ستلج اور برہمپتر کو ایک دریا نہیں کہہ سکتے تو پھر یقیناً اردو اور ہندی کو بھی دو الگ الگ زبانیں کہنا پڑے گا۔“

اردو آوازیں بیشتر ہند آریائی سے ماخوذ ہیں صرف چند آوازیں ق، ف، ز، ژ، ذ، خ، غ، ایسی ہیں جو عربی اور فارسی کے زیر اثر اردو میں داخل ہوئیں

ہکار بندشیہ آوازیں بھ پھ تھ ٹھ دھ ڈھ کھ گھ چھ جھ ڑھ وغیرہ ان کے علاوہ معکوسی آوازیں ٹ، ڈ، وغیرہ ان کے ہکار روپ بھی ہندی اور اردو میں مشترک ہیں۔ جو نہ فارسی میں ہیں نہ عربی میں۔ مصوتوں میں تو صوتی ہم آہنگی سو فیصدی نظر آتی ہے، دونوں کے بنیادی مصوتے دس ہیں جن میں کوئی فرق نہیں۔ اردو اور ہندی کے رشتے پر گفتگو کرتے ہوئے اصوات کے علاوہ ذخیرۂ الفاظ کا تناسب بھی یاد رکھنا چاہیے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو سب سے زیادہ تعداد تدبھو الفاظ کی ہے جو سنسکرت کے ''تتسم'' کا بگڑا ہوا روپ ہے۔ آج سے 70 سال قبل ''فرہنگ آصفیہ'' کے مولف سید احمد دہلوی نے ''ندیم'' 1938 کے ایک شمارے میں لکھا تھا کہ — اردو زبان کا کل سرمایہ 55 ہزار الفاظ ہیں، جن میں سے 23 ہزار الفاظ خالص ہندی زبان کے ہیں، 28 ہزار ایسے ہیں جو ہندی الاصل تو نہیں لیکن انھیں ہندی قواعد کے مطابق بنالیا گیا ہے۔ اس طرح 55 ہزار میں سے 41 ہزار الفاظ ہندی کے اور بقیہ 14 ہزار دوسری زبانوں کے الفاظ ہوئے۔ گویا اردو زبان کی ترکیب میں ایک حصہ عربی و فارسی الفاظ اور تین چوتھائی حصہ ہندی الفاظ کا ہے۔ اگر فارسی کو بھی آریائی زبان قرار دیا جائے تو عربی زبان کے سامی الاصل الفاظ محض 7 ہزار رہ جائیں گے۔ پروفیسر گیان چند جین نے بھی ''فرہنگ آصفیہ'' کے حوالے سے ہی اردو میں ہندوستانی الفاظ کا تناسب ساڑھے 73 فیصد بتایا ہے جبکہ عربی، فارسی، ترکی الفاظ کا تناسب صرف ساڑھے پچیس فیصد ہے۔ اردو کا فعلیہ ڈھانچہ سارا کا سارا ہندی سے مشترک ہے اور فعل زبان کی ریڑھ کی ہڈی ہے جس کے بغیر جملے کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ اگرچہ اردو نے عربی و فارسی سے بھی ہندوستانی قاعدے کے مطابق کئی نئے فعل بنائے ہیں مثلاً: بدلنا، فرمانا، شرمانا، خریدنا، بخشنا، نوازنا، قبولنا، لرزنا، داغنا وغیرہ جو اس کی اختراعی قوت کی مثال ہیں۔ فعلوں کا دونوں زبانوں میں یکساں ہونا اس صداقت کے اعتراف کے لیے کافی ہے کہ دونوں کا ارتقا تو آزادانہ طور پر ہوا ہے لیکن دونوں کی جڑیں ایک دوسرے میں پیوست ہیں۔ دونوں زبانوں کے مرکب افعال میں بھی یکسانیت دیکھنے کو ملتی ہے۔ مثلاً۔ بتا دینا، گر پڑنا، چلے آنا، ٹوٹ جانا، مار ڈالنا، بولا کرنا وغیرہ۔ مرکب افعال دراصل محاوروں کی حیثیت رکھتے ہیں اور ایسے محاوروں کی تعداد بھی بیشمار ہیں، جو دونوں زبانوں میں یکساں طور پر رائج ہیں۔ مثلاً منہ آجانا، منہ بھر آنا، منہ پر خاک اڑانا، منہ لال ہوجانا، منہ کالا کرنا، آنکھ آنا، آنکھ پتھرانا، آنکھ نکالنا، آنکھ پر پردہ پڑنا وغیرہ۔

اردو اور ہندی فعلی مادّوں (مثلاً: آ، جا، چل، سن، اٹھ، لکھ وغیرہ) فعلیہ ترکیبوں (لکھ کر، بول کر، گرتے پڑتے، اٹھتے بیٹھتے، وغیرہ) اور فعلیہ لاحقوں (ہے، ہو، ہوں، ہیں، تھا، تھے، تھی، تھیں، گا، گے، گی وغیرہ) کے علاوہ بھی بہت سی چیزیں ہیں جو مشترک ہیں۔ مثلاً حرف جار (نے، سے، پر، تک، کا، کے، کی، کو، میں) کلمات استفہامیہ (کیوں، کب، کہاں، کیسے، کدھر، کن) کلمات تشبیہ (ایسے، جیسے، ویسے) کلمات اشاریہ (ادھر، ادھر، یہاں، وہاں، جہاں) کلمات زمانی (اب، جب، تب، ابھی، جبھی، تبھی، کبھی) شخصی وغیر شخصی ضمائر (میں، ہم، تو، تم، آپ، وہ) ان کے تصریفی شکلیں (مجھ، تجھ، میرا، تیرا، ہمارا، تمھارا، انھیں، ہمیں) بنیادی اعداد (ایک، دو، تین، چار) توضیحی اعداد (پہلا، دوسرا، تیسرا، چوتھا وغیرہ)۔ اسی طرح قرابت داری کے بنیادی الفاظ (ماں، باپ، بھائی، بہن، بیٹا، بیٹی، دادا، نانا، نانی وغیرہ)۔ جسم کے اعضا کے نام سر، پیر، ناک، کان، ہونٹ، گردن، پیٹ، پیٹھ، کمر، گھٹنا، کہنی، ایڑی وغیرہ) حروف فجائیہ (واہ واہ! ہائے ہائے! آہ آہ! وغیرہ) دونوں زبانوں میں یکساں استعمال ہوتے ہیں۔

اس ضمن میں تلمیحوں اور کہاوتوں کی مثال بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ گرچہ اردو زبان کی بیشتر تلمیحیں اسلامی روایات سے متعلق ہیں پھر بھی بعض تلمیحیں مثلاً کرشن، رادھا، رام، لچھمن، سیتا، ارجن، بھیم، ہیر رانجھا وغیرہ ہندوستانی روایات سے تعلق رکھتی ہیں اور دونوں زبانوں میں مشترکہ طور پر مستعمل ہیں۔ یہ اشتراک کہاوتوں میں بھی نظر آتا ہے مثلاً جیسا دیس ویسا بھیس، دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا، ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے، گھر کی مرغی دال برابر، چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات، چور کی داڑھی میں تنکا، ایک انار سو بیمار، دور کے ڈھول سہانے، جس کی لاٹھی اس کی بھینس، بچہ بغل میں ڈھنڈورا شہر میں، دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک کر پیتا ہے، بھاگتے بھوت کی لنگوٹی سہی، گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے، وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح بیشتر صوتیے ڈھانچے کا اردو اور ہندی میں ایک ہونا تین چوتھائی الفاظ کا دونوں زبانوں میں مشترک ہونا، فعلیہ ڈھانچے، بنیادی لفظیات، اعداد، ضمائر، حروف جار، استفہامیہ، عوامی محاوروں، کہاوتوں، ضرب الامثال میں اشتراک وغیرہ یہ ایسی مثالیں ہیں جو کہیں اور نہیں ملیں گی۔

اردو اور ہندی کا لسانی رشتوں کے سلسلے میں کچھ اختلافی صورتیں بھی پائی جاتی ہیں جیسے بعض الفاظ کے مختلف تلفظ یا ہندی کے برخلاف اردو میں چھوٹے مصوتوں کی علامت کو ختم کردیا جانا، جیسے ہندی 'نا' اردو میں 'نہ' کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ بعض ایسے الفاظ جو 'ن' پر ختم ہوتے ہیں دونوں زبانوں میں ان کا تلفظ مختلف ہے۔ ہندی کی مالن اور پجارن اردو میں مالَن اور پجارَن بن جاتی ہے۔ بعض الفاظ جنھیں ہندی میں مشدد بولا جاتا ہے، اردو میں غیر مشدد ہوجاتے ہیں بودھ اور سکھ اردو میں تشدید کے بغیر بودھ اور سکھ بولے جاتے ہیں۔ اردو میں کچھ ایسی بھی آوازیں ہیں، خاص طور سے ہائیہ اور معکوسی

آوازیں، جن کو مشترک آوازیں کہہ سکتے ہیں۔ دونوں زبانوں میں سب سے اہم اور نمایاں فرق رسم الخط ہے۔ اردو فارسی رسم الخط میں داہنی طرف سے لکھی جاتی ہے۔ ہندی دیوناگری رسم الخط میں بائیں طرف سے۔ دونوں زبانوں کے درمیان ان اختلافات کے باوجود مماثلتیں کہیں زیادہ ہیں اور ان کی سب سے اہم اور مضبوط بنیاد دونوں زبانوں کا ہند آریائی ماخذ ہے۔

اردو میں اصلاح زبان کی تحریکیں چلیں۔ دہلی اور لکھنؤ کی انفرادی لسانی شناخت قائم کرنے کی کوششیں ہوئیں۔ لیکن اردو کا مزاج ہمیشہ سے میل جول کا رہا ہے۔ دکنی ادب کے علاوہ اردو ادب کے قدیم نمونے جو شمالی ہندوستان میں دستیاب ہوئے ہیں وہ اس کی گواہی دیتے ہیں۔ دوہے، پہیلیاں کہہ مکرنیاں اور صوفی شعرا کا کلام ہندوی روایت کا خاص امین ہے۔ امیر خسرو کو ہندی اور اردو والے دونوں اپناتے ہیں۔ دوسری طرف قطب شاہ، وجہی، نصرتی، غواصی، مقیمی، ابن نشاطی، فائز، ولی، اور سراج وغیرہ ایسے شعرا ہیں جن کی غزلیں اور مثنویاں قدیم اردو کا ایسا سرمایہ ہیں جسے ہندی والے بھی اپنانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ ہندی ادب سے مخصوص دوہا، گیت، بارہ ماسہ جیسی شعر اصناف کا فروغ اردو میں بھی ہوا ہے۔ دوہے اور گیت اردو میں آج بھی لکھے جا رہے ہیں۔ چونکہ ہندی اور اردو ایک ہی لسانی خاندان اور ایک ہی جغرافیائی خطے میں پیدا ہوئی ہیں اور دونوں زبانوں کا فروغ بھی ایک ساتھ ہوا ہے۔ نتیجتاً دونوں نے سماج اور ماحول کا بھی یکساں اثر قبول کیا ہے۔ اردو شاعری میں تصوف عشق اور وحدت الوجود کے فلسفے کی پشت پر ہندوستان کے مقامی تصورات کام کر رہے ہیں۔ کربلا کے واقعات کے بیان پر مبنی انیس اور دبیر اور دوسرے شعرا کے مرثیے بھی جن کا پس منظر عرب کی سرزمین ہے، ہندوستانی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔

ہندوستان کی پرانی کہانیوں نے بھی ہندی اور اردو زبان کو یکساں مواد فراہم کیا ہے۔ پریم چند کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت بالکل واضح ہو جائے گی کہ اردو اور ہندی کس طرح ایک ساتھ اٹھتی، بیٹھتی، کھاتی اور پیتی نظر آتی ہیں۔ ہندو دیو مالا یا ہندوستانی اساطیر نے بھی اردو ادب کو متاثر کیا ہے جس کا تجزیہ دوسرے نقادوں کے علاوہ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے بھی اپنے ایک مضمون میں کیا ہے۔ قرۃ العین حیدر کا ناول ''آگ کا دریا'' اس کی ایک روشن مثال ہے۔ محسن کاکوروی نے اپنے مشہور نعتیہ قصیدے ''سمتِ کاشی سے چلا جانب متھرا بادل'' کی تشبیب میں مقامی فضا کی جس خوبصورتی سے عکاسی کی ہے اس سے سب واقف ہیں۔ عہد حاضر کے اکثر شعرا ہندوستانی تشبیہات و علامات سے کام لیتے نظر آتے ہیں۔

آج لسانی عصبیت کی بنیاد پر بعض حلقوں کی طرف سے اردو کی مخالفت کی جاتی ہے۔ لیکن تاریخی، لسانی، ادبی، سماجی، تہذیبی اور ثقافتی حقیقتیں جھٹلائی نہیں جا سکتی ہیں۔

□□□

پتہ:
Deptt. of Urdu,
Magadh University,
Gaya

اندر سبھا کی روایت

مصنف: پروفیسر محمد شاہد حسین

سنسکرت ڈرامائی روایات کی زائیدہ ''اندر سبھا کی روایت'' ایک ایسی روایت ہے جس نے ہندوستانی ڈرامائی روایات کی توسیع کے ساتھ ایک صدی تک اردو ڈرامے پر اپنے اثرات مرتب کیے، پروفیسر محمد شاہد حسین نے بڑی باریکی سے اس کا جائزہ لیا ہے۔ تین باب اور کئی ذیلی ابواب کے تحت انھوں نے سنسکرت ڈرامے کی روایات، عوامی روایات جیسے رام لیلا، راس لیلا، بہروپیا، بھنڈیتی، بھگت بازی، نقالی، کٹھ پتلی کا ناچ، داستان گوئی، مرثیہ خوانی، مجرے، درباری ڈرامے اور پارسی اسٹیج کا ادبی و فنی نقطۂ نظر سے تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ کیا ہے۔

صفحات: 343، قیمت: -/140 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

صادق

سدیپ بنرجی: ہندی کویتا کا منفرد شاعر

سدیپ بنرجی نئی ہندی کویتا کے اہم شاعروں میں تھے۔ ان کی مادری زبان بنگالی تھی اور ذریعۂ تعلیم ہندی رہا، اردو رسم الخط سے وہ ناواقف تھے لیکن ان کی شاعری میں اردو الفاظ کا بہ کثرت اور برمحل استعمال ہوا ہے۔ وہ کچھ عرصے سے بیمار تھے اور 10فروری 2009 کو ان کا انتقال ہوگیا۔ ہم ان کی شخصیت اور شاعری پر ان کے قریبی دوست اور اردو کے ممتاز شاعر پروفیسر صادق کا مضمون شائع کررہے ہیں جو سدیپ بنرجی کی زندگی میں لکھا گیا تھا اور ان کے انتقال سے چند روز قبل ہی ہمیں اشاعت کے لیے موصول ہوا تھا۔ — ادارہ

سدیپ بنرجی کی نظمیں عصری ہندی شاعری کے ایک ایسے کوی کے فکروفن کا نمونہ ہیں جو بساطِ ادب کی تمام گروہ بندیوں اور شوروشغب سے دور اور ستائش وصلے سے بے پروا گذشتہ چالیس بیالیس برسوں سے سنجیدگی کے ساتھ تخلیقی سرگرمیوں میں مصروف ہے۔ ظاہر ہے یہ شعروادب کے ساتھ اس کے گہرے اور اٹوٹ رشتے کا بیّن ثبوت ہے۔

اردو شاعری کے مخصوص مزاج کے خوگر دوسری زبانوں سے متاثر ہوں ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ دراصل اردو شاعری کا قاری یا سامع شعری زبان واسلوب کے معاملے میں بہت زیادہ حساس ہوتا ہے۔ اس نے خواہ فصاحت و بلاغت کا علم حاصل نہ کیا ہو، صنائع لفظی اور صنائع معنوی کا باقاعدہ درس نہ لیا ہو، یا علم عروض کا مطالعہ نہ کیا ہو، تاہم اس کے پاس سخن فہمی کا جو ایک خاص اور بلند معیار ہوتا ہے اس تک دوسری زبانوں کے قاری شاید شاذ و نادر ہی پہنچتے ہوں۔ ممکن ہے کہ اردو شاعری کا قاری ہندی کی غنائی شاعری کو کسی حد تک پسند کرلے لیکن وہ 1960 کے بعد کی ہندی کویتا (جو بالعموم نثری نظم ہے) سے فکری طور پر تو متاثر ہوسکتا ہے لیکن یہ اس کے ذہن و ذوق کی تسکین کا ذریعہ نہیں بن پاتی یا مشکل ہی سے بنتی ہے۔ فراق گورکھپوری نے اب سے تیس چالیس برس پہلے جب اپنے ذاتی افکار و تجربات کی روشنی میں ہندی اور اردو قارئین سے متعلق کچھ ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا تھا تو بہت سے ہندی دوست ان سے ناراض ہوگئے تھے۔

سدیپ بنرجی کی کویتائیں ان کے ہم عمر اور ہم عصر ہندی کویوں سے کافی مختلف ہیں۔ ان کے موضوعات، ان کی زبان، ان کا اسلوب اور شعری جمالیات منفرد ہیں، اپنے ہم عصر اور پیش رو ہندی کویوں میں سے کسی کی گہری چھاپ ان کی کویتاؤں پر نظر نہیں آتی۔ انھوں نے مہادیوی ورما، سمترا نندن پنت، سوریہ کانت ترپاٹھی نرالا اور شومنگل سنگھ سمن وغیرہ کو دیکھا، سنا اور پڑھا ہے اور ان کا احترام بھی کیا ہے۔ شومنگل سنگھ سمن سے ان کی قربت اور گجانن مادھو مکتی بودھ سے عقیدت بھی میں نے دیکھی ہے لیکن زمانۂ طالب علمی میں وہ چندرکانت دیوتالے سے زیادہ نزدیک رہے ہیں۔ اس تعلق کی نوعیت استاد شاگرد کے رشتے سے کہیں زیادہ دوستانہ تھی کہ اس زمانے میں دیوتالے صاحب خود بھی اپنے تخلیقی اظہار کے ابتدائی مراحل سے گزر رہے تھے اور نئی کویتا کے میدان میں اپنی پہچان بنانے کے لیے کوشاں تھے۔ 'تارسپتک' اور 'دوسرا سپتک' کی اشاعت کے بعد کا یہ زمانہ ہندی کی نئی کویتا کے لیے سنکٹ کی گھڑی سے کم نہ تھا۔ بڑی افراتفری کا عالم تھا۔ ان دنوں آدھونکتا کے نام پر ہر طرف اپنی اپنی ڈفلی بجا کر اپنے اپنے راگ الاپے جارہے تھے۔ لگھو پتریکاؤں کی اشاعت نے بھی ایک آندولن کی شکل اختیار کرلی تھی جن کے ذریعے اچھے، برے اور بہت برے قلمکار خود کو نمایاں کرنے میں مصروف تھے۔ آئے دن نئے نئے میلانات اور چونکا دینے والے بیانات سامنے آرہے تھے۔ نئے نئے کویوں کے چھوٹے چھوٹے گروہوں کے ذریعے نئی کویتا کے نئے نئے آندولن جنم لے رہے تھے جن کے نتیجے میں پرگتی شیل نئی کویتا، سناتن سوریودئی نوتن کویتا، کردھ یوواپیڑھی کی کویتا، شمشانی پیڑھی کی کویتا، اکویتا، شدھ کویتا، ٹھوس کویتا، اگلی کویتا، تازی کویتا اور ابھی ابھی لکھی کویتا وغیرہ ناموں سے قسم قسم کی کویتائیں منظر عام پر آرہی تھیں۔ ان دنوں جدیدیت کے زیر اثر اردو ادب بھی بڑی تبدیلیوں کے عمل سے گزر رہا تھا۔ اردو اور ہندی کے علاوہ ملک کی دوسری کئی زبانوں میں بھی لگ بھگ یہی صورت حال تھی۔ بانگلا میں بھوکی پیڑھی، مراٹھی میں ابھیوکاویہ اور تلگو میں دگمبر پیڑھی کے قلم کار اپنے نوجوانانہ جوش وخروش کے بل پر کچھ نیا کر دکھانے کو بے قرار نظر آرہے تھے۔ وسطِ ہند کے قدیم، تاریخی، تہذیبی اور مذہبی تقدس کے حامل شہر اجین میں بیٹھے سدیپ بنرجی، میں اور چند دیگر دوست ان تبدیلیوں سے نہ صرف باخبر تھے بلکہ بڑی حد تک ان سے متاثر بھی

تھے۔ اسی زمانے میں دہلی سے شائع ہونے والے ادبی رسالے ''مادھیم'' میں سدیپ بنرجی کی ایک نظم شائع ہوئی۔ کالج کے ایک ذہین و باصلاحیت نوجوان اور مقرر کی حیثیت سے تو وہ ایک حلقے میں خاصے مشہور و مقبول تھے ہی اب ایک نئے کوی کی حیثیت سے بھی ان کی شناخت قائم ہونے لگی لیکن وہ صرف کوی بن کر کبھی نہیں رہے۔ انگریزی ادبیات میں پوسٹ گریجویشن کر لینے کے بعد وہ مادھو کالج کے شعبۂ انگریزی میں لکچرر ہو گئے۔ ایل ایل بی بھی کیا، پھر رتلام میں کئی سال کلکٹر رہے اور پھر ترقی کی منزلیں طے کرتے ہوئے حکومتِ ہند کی وزارت برائے فروغ انسانی وسائل میں ایجوکیشن سکریٹری کے عہدے پر فائز ہوئے لیکن اس تمام عرصے میں سدیپ نے کویتا لکھنی نہ چھوڑی یا یوں کہہ لیجیے کہ کویتا نے ان کا دامن نہ چھوڑا۔ ایسی شدید ترین مصروفیتوں کے درمیان جہاں کویتا کے بارے میں سوچنا بھی محال ہو، کویتائیں لکھتے رہنے کا عمل مجھے تو سدیپ کی شخصیت کا ایک پراسرار پہلو معلوم ہوتا ہے اور اس کا یہ فکر انگیز جملہ یاد دلاتا ہے کہ دوسری چیزوں سے دل شکستہ ہو کر میں کویتا کی طرف آتا ہوں، یہاں سے تھک کر دوسرا کام کرنے نہیں جاتا۔

سدیپ بنرجی کویتائیں تخلیق کرنے کے بعد ان کویتاؤں کے ساتھ بے نیازی کا جو رویہ اختیار کرتے ہیں وہ بھی کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ اپنی کویتائیں دوسروں کو سنانے، باقاعدگی کے ساتھ انھیں رسائل و جرائد میں شائع کرانے، ان کی تشہیر کرنے کرانے اور ان پر ناقدینِ ادب سے کچھ لکھوانے چھپوانے کے معاملے میں وہ ہمیشہ بے نیازی کا ثبوت دیتے رہے ہیں۔

سدیپ بنرجی کی کویتائیں پڑھتے ہوئے قاری کو سب سے پہلے جو بات متاثر کرتی ہے وہ اردو الفاظ کا بے تکلف استعمال ہے۔ ان کی کویتاؤں کے تینوں مجموعوں کے نام بھی اردو الفاظ پر مشتمل ہیں۔) انھوں نے دورانِ تعلیم کسی بھی سطح پر رسمی طور پر اردو زبان نہیں پڑھی۔ سنسکرت البتہ اسکول اور کالج کی سطح پر باقاعدہ پڑھی ہے۔ ان کی مادری زبان بانگلا ہے لیکن اسکول کی سطح تک ان کا ذریعۂ تعلیم ہندی رہا ہے۔

سدیپ نے اپنے تخلیقی اظہار کے لیے بانگلا یا انگریزی کی بجائے ہندی کو اختیار کیا تو ظاہر ہے کہ اس کی کوئی خاص وجہ رہی ہوگی۔ مجھے تو اس پر حیرت ہوتی ہے کہ سنسکرت جاننے اور گریجویشن کی سطح تک سنسکرت زبان و ادب کا مطالعہ کرنے کے باوجود ان کے ڈکشن میں سنسکرت لفظیات سے گریز اور اردو سے حد درجہ انسیت کا رویہ نمایاں نظر آتا ہے۔ میں اسے شعوری کوشش تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ ممکن ہے یہ اس کے بچپن کے ایک قریبی دوست اور ہم جماعت غلام مصطفیٰ سے گہری قربت کا اثر ہو۔ ''شب گشت'' کی ایک نظم ''امیر خسرو کے تھوڑا پہلے'' میں اس کا سراغ پانے کی کوشش ممکن ہے لیکن وہاں صرف ہلکا سا اشارہ ہی ملتا ہے کیونکہ سدیپ بقول خود پوری طرح سے اپنی نظموں میں نہیں۔

اپنی کویتاؤں میں اردو الفاظ کو برتنے کا سدیپ بنرجی کا جو مخصوص طرز و انداز ہے اس کی نظیر ہم عصر ہندی کویتا میں کہیں اور نہیں ملتی۔ اس موقعے پر شمشیر بہادر سنگھ کی یاد آنا سوبھاوک ہے لیکن سدیپ کی کویتاؤں میں اردو الفاظ کچھ اس طرح استعمال ہوتے ہیں کہ کویتا کی فضا کو جیسی وہ ہے ویسی ہی بنائے رکھتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ انھیں سیاق و سباق سے علاحدہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس فضا میں ان کے مفاہیم سیاق و سباق طے کرتے ہیں، اردو میں مروجہ معنی نہیں۔ ان کویتاؤں کو اردو میں منتقل کرتے ہوئے بسا اوقات مجھے بڑی الجھن ہوئی۔ کئی جگہ پریشانیوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ تقریباً ساٹھ فیصد اردو الفاظ پر مشتمل ان کویتاؤں کو اردو کے قالب میں پیش کرتے وقت میں نے خود کو کئی بار عجیب مشکل میں پایا۔ کسی مصرعے کے ہندی لفظ کا اردو مترادف رکھنے کی کوشش کرتا تو مفہوم مجروح ہو جاتا اور ویسے ہی رہنے دیتا تو بے اطمینانی محسوس کرتا۔ یہ فکر لاحق ہو جاتی کہ اردو کے بعض قاری اسے سمجھ نہیں سکیں گے۔ اسی طرح کئی جگہ سدیپ کا استعمال کیا ہوا اردو لفظ ترجمہ شدہ کویتاؤں کے سیاق و سباق میں کہیں بے محل، کہیں اجنبی اور نامانوس معلوم ہوتا۔ مجھ سے پہلے 'زخموں کے کئی نام' کے ترجمہ نگاروں (شاہد ماہلی اور سرور ماہلی) کو بھی یہی مشکل درپیش آئی تھی جسے ہندی کتھا کار شانی کے مشورے کے مطابق صرف رسم خط کو تبدیل کر کے حل کرنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن اس طرح بات بنتی نہیں۔ لفظوں کے سامنے انسان کی بے بسی کا تجربہ بھی عجیب چیز ہے۔

اپنی صلاحیتوں کو ملک و قوم کی فلاح و بہبود کے کاموں میں استعمال کرنے کا قوی جذبہ رکھنے اور عملی طور پر شب و روز اس کام میں سرگرم ہونے کے ساتھ ساتھ سدیپ کو اس حقیقت کا پورا احساس رہا کہ محض کویتاؤں کے ذریعے حالات کو نہیں بدلا جا سکتا مگر ہمارے عہد کا انسان جن حالات و ماحول میں زیست کر رہا ہے اور جن ناگفتہ بہ تجربات و صدمات سے گزر رہا ہے اس کی عکاسی ضرور کی جا سکتی ہے گو کہ یہ بھی کوئی آسان کام نہیں۔ عام طور پر لوگ بربنائے مصلحت حق گوئی سے گریز کرنے میں ہی اپنی عافیت سمجھتے ہیں۔ بیشتر فنکار خواہش کے باوجود سچ نہیں بول پاتے۔ وہ اپنے تخلیقی اظہار میں کویتا میں صداقت بیانی کے دعوے تو کرتے ہیں لیکن درحقیقت سچ بولنے کا ناٹک کرتے نظر آتے ہیں۔ معدودے چند ہی ایسے ہوتے ہیں جو نہ تو اس کے لیے شعوری کوشش کرتے ہیں اور نہ بلند بانگ دعوے۔ وہ سوزش دل اور جذبۂ خلوص و دردمندی سے جو سخنِ گرم لکھتے ہیں وہی سادہ و پرکار تخلیقات اپنے عہد کی سچائیوں کا میثاق بن جاتی ہیں۔

سدیپ بنرجی کی نظمیں پڑھتے ہوئے کئی بار ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ موجودہ نظام اقتدار کا حصہ ہوکر بھی اس کی کمزوریوں کی طرف انگشت نمائی کرنے، ان پر طنز کرنے اور ضرورت آنے پر ان پر وار کرنے سے بھی نہیں چوکتے ہیں۔ عام طور پر ایسے لوگ عصری صداقتوں سے صرف نظر کر جاتے ہیں، خطرات سے ڈر جاتے ہیں۔ یوں بھی ہوتا ہے کہ مرتبے کی بلندی انھیں طبقۂ بالا کے ساتھ مفید تعلقات تک ہی محدود رکھتی ہے اور ان کی نگاہیں نہ صرف پستیوں میں زندگی بسر کرنے والوں تک پہنچ نہیں پاتیں بلکہ فطرت اور اس کی نیرنگیوں کے نظاروں سے بھی محروم رہتی ہیں لیکن سدیپ بنرجی کا معاملہ ان کے برعکس ہے۔ ان کی کویتاؤں کی ایک خصوصیت فطرت اور اس کے مظاہر سے ان کی غیر معمولی دلچسپی بھی ہے۔ ان کی کویتاؤں میں جابجا درخت، جنگل، پہاڑ اور ندیاں نظر آتی ہیں۔ شکنتلا، اروشی اور امر پالی جیسی اساطیری حسینائیں ملتی ہیں۔ سڑک، دفتر، بس اسٹاپ، پلیٹ فارم، مال گاڑی اور بجلی کے کھمبے دکھائی دیتے ہیں۔ معروف و ممتاز شخصیات کی بجائے دتیا بھیل، روشن لال، ہیرا سنگھ، دین محمد، منوہر لال، کاشی ناتھ اور گوردھن لال ماسٹر جیسے عموماً نظر انداز کردیے جانے والے حاشیے کے کردار نظر آتے ہیں جو نامساعد حالات میں اپنے اپنے مسائل و مصائب کے ساتھ زندگی بسر کررہے ہیں۔ سدیپ کی کویتاؤں میں بے کس و بے نوا مظلوم آدی باسی ہیں، تعلیم و تربیت سے محروم معصوم بچے ہیں۔ بنیادی انسانی حقوق سے ناآشنا، جہالت و مفلسی اور ظلم و ستم کے شکار انسان ہیں۔ اقلیت ہونے کا دکھ جھیلتے پسماندہ مسلمان ہیں جن تک پہلے تو طبقۂ اعلیٰ کے افراد یا بلند مرتبہ عہدیداروں کی ہمدردانہ نظریں نہیں جاتیں اور اگر جاتی بھی ہیں تو فوراً ہی لوٹ آتی ہیں۔ پھر سب کچھ نظرانداز ہوکر رہ جاتا ہے۔ سدیپ کی کویتائیں پڑھ کر لگتا ہے کہ انھوں نے نہ صرف ان سب کو بہ نظر غائر دیکھا اور ان کے بارے میں سوچا ہے بلکہ ان کے مسائلِ حیات کو حقیقی تناظر میں سمجھنے، ان کے دکھ درد کو محسوس کرنے اور اس طور اپنے عہد کی انسانی زندگی کو دیکھنے دکھانے کی مخلصانہ سعی کی ہے اور یہ کام سدیپ بنرجی جیسا دردمند انسان ہی سرانجام دے سکتا تھا۔

□□□

پتہ:
AG-1/47-C, Vikas Puri,
New Delhi-110018

منتخب التواریخ (جلد اوّل، دوم وسوم)

مؤلف: ملا عبدالقادر بدایونی / مترجم: ڈاکٹر علیم اشرف خاں

عبدالقادر بن ملوک شاہ بدایونی نہ صرف باکمال شاعر تھے بلکہ تاریخ نویسی میں بھی انھیں ملکہ حاصل تھا۔ معروف مورخ ابوالفضل کے ہمعصر ہونے کے ساتھ ساتھ انھیں بھی اکبری دربار میں رسائی حاصل تھی۔ انھیں ترجمہ اور تالیف پر مامور کیا گیا تھا۔ اسی دوران انھوں نے تاریخ الفی، رزم نامہ، جامع رشیدی اور بحرالاسمار جیسی کتابیں لکھیں۔ اکبری عہد کی ساٹھ سالہ تاریخ سے آگاہی کے لیے ابوالفضل کے ''اکبرنامہ'' کے ساتھ ساتھ ملّا عبدالقادر کی ''منتخب التواریخ'' (تین جلدوں میں) کا مطالعہ بھی ناگزیر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ملّا عبدالقادر نے یہ تاریخ شاہی محل میں بیٹھ کر نہیں لکھی جو بادشاہ اکبر کی پسند و ناپسند سے گزرتی بلکہ آزادانہ تحریر کی اور یہی آزادانہ رائے اس کتاب کو ''اکبرنامہ'' سے منفرد کرتی ہے۔

صفحات: جلد اوّل 409 / جلد دوم وسوم 620، قیمت: جلد اوّل -/335 روپے / جلد دوم وسوم 555 روپے

جتنے پاس اتنے دور

مصنف: دھیریندر سنگھ جفا

''جتنے پاس اتنے دور'' انڈین فائٹر پائلٹ کی آپ بیتی ہے جو ناول کے اسلوب میں لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب دھیریندر سنگھ جفا نے پہلے انگریزی میں لکھی بعد میں ڈی گھیا نے اسے بنگلہ میں ترجمہ کیا، پھر ہندی ترجمہ خود مصنف نے اپنے دوست سید مزمل فدا کے تعاون سے کیا اور اب اردو ترجمہ جناب شاہد جمال نے کیا ہے جسے قومی اردو کونسل نے حال ہی میں شائع کیا ہے۔ اس آپ بیتی میں 1970 سے 1972 تک ہندوستان اور پاکستان کی جنگوں کے توسط سے تقسیم شدہ ہندوستان کے ٹوٹے بکھرے دلوں کی آہوں اور کراہوں کو بڑی صفائی اور صدق دلی سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اپنے ملک کی حفاظت اور انسانی رواداری کے باب میں ہمارے جذبے اور احساس پر گہرے اثرات مرتسم کرتی ہے۔

صفحات: 270، قیمت: -/145 روپے

پردیپ جین

پریم چند اور آریہ سماج

اپنے استاد سوامی برجانند کی رحلت (14 ستمبر 1868) کے تقریباً سات برس بعد اور منشی پریم چند کی ولادت (31 جولائی 1880) سے تقریباً پانچ برس قبل سوامی دیانند سرسوتی نے 10 اپریل 1875 کو ممبئی میں آریہ سماج کے نام سے اس تنظیم کا سنگِ بنیاد رکھا جس نے آنے والے وقتوں میں ملک کے سماجی ماحول کو درست کرنے اور برطانوی سامراج کا طوقِ غلامی اتار پھینکنے کی ترغیب دی۔

سوامی دیانند نے ہندو سماج میں پائی جانے والی برائیوں کے خلاف ایک زبردست تحریک چھیڑ دی۔ انھوں نے مشرکانہ تصورات کے برخلاف وحدانیت کی تلقین کی، ذات پات سے علاحدہ رہ کر پوری دنیا کو ایک آریہ برادری کے طور پر دیکھنے پر زور دیا، کم عمری کی شادیوں کی مخالفت کی، بیواؤں کی دوبارہ شادی کی حمایت کی اور مختلف وجوہ کی بنا پر ویدک دھرم چھوڑ کر دیگر مذاہب اختیار کر لینے والوں کو ہندو سماج میں واپس لانے کے لیے شدھی تحریک کا آغاز کیا۔ آریہ سماج کی کوششوں سے تعلیم کو بھی فروغ ملا۔ پورے ملک میں پھیلا ہوا ڈی۔اے۔وی۔ اسکولوں اور کالجوں کا جال اس سمت آریہ سماج کی کاوشوں کا آئینہ دار ہے۔ واضح رہے کہ ملک کی پہلی قومی یونیورسٹی گورو کل کانگڑی آریہ سماج کے زیرِ اہتمام ہی قائم ہوئی تھی۔ حالانکہ آریہ سماج قائم کرنے کے تقریباً آٹھ برس بعد ہی 30 اکتوبر 1883 کو سوامی دیانند سرسوتی جی اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئے مگر ان کے پیرو، ان کے دکھائے راستے پر چلتے رہے۔ 1901 میں جب منشی پریم چند نے ادبی کوچے میں قدم رکھا اس وقت ملک میں آریہ سماج اور سوامی دیانند سرسوتی اصولوں کا عام شہرہ تھا جس سے پریم چند جیسے حساس تخلیق کار کا بے نیاز رہنا غیر ممکن تھا۔

پریم چند کا پہلا ناول بنارس سے منشی گلاب رائے کی ادارت میں شائع ہونے والے ہفت روزہ ''آوازۂ خلق'' میں 8 اکتوبر 1903 سے یکم فروری 1905 تک بالاقساط شائع ہوا تھا جس کا عنوان تھا ''اسرارِ معابد''۔ اپنے اس پہلے ہی ناول میں پریم چند آریہ سماج کی سماجی اصلاح کی تحریک سے متاثر نظر آتے ہیں۔ ناول میں پریم چند نے مندروں کے مہنتوں اور پجاریوں کی بداعمالیوں کو جس طرح بے نقاب کیا ہے وہ اس کا واضح ثبوت ہے کہ پریم چند آریہ سماج کی اصلاحی تحریک سے متاثر تھے اور بت پرستی اور اس کے پس پردہ ہونے والی بدکاریوں کے خلاف تھے۔

پریم چند بیواؤں کی دوبارہ شادی کے حق میں عوام کو تیار کرنے کی آریہ سماج کی کوششوں سے بھی متاثر ہوئے ''ہم خرما و ہم ثواب'' 1906 میں شائع کرایا۔ پریم چند نے اس ناول کا ہندی ترجمہ کر کے 1907 میں ''پریما'' عنوان کے تحت شائع کرایا تاکہ وہ اپنے خیالات کو ہندی قارئین تک بھی پہنچا سکیں۔ غور طلب ہے کہ 1915 میں باقاعدہ طور پر ہندی ادبی دنیا میں داخل ہونے تک کی 15 برس کی تخلیقی زندگی میں ''پریما'' وہ واحد تخلیق ہے جسے پریم چند نے ہندی میں شائع کرایا۔

جس وقت پریم چند بیواؤں کی دوبارہ شادی کی حمایت میں ناول لکھ رہے تھے اسی وقت انھوں نے آریہ سماج کے اصولوں کو عملی جامہ پہنانے کا بھی مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ انھوں نے 1907 میں کم عمر میں بیوہ ہوئی محترمہ شورانی دیوی سے شادی کر کے آریہ سماج کے اصولوں پر عمل پیرا ہونے کی عملی مثال قائم کی۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا آریہ سماج نے مختلف وجوہ سے ہندو دھرم چھوڑ کر دیگر مذاہب اختیار کرنے والوں کو ہندو دھرم میں واپس لانے کی غرض سے شدھی تحریک کا آغاز کیا تھا۔ اس تحریک کے درمیان جب ملکانہ راجپوت مسلمانوں کو جبراً شدھ کرنے کی خبر کے ساتھ ساتھ اس کے خلاف مسلم طبقے کے متحد ہونے کی خبر پریم چند کو ملی تو انھوں نے ماہنامہ ''زمانہ'' کے مئی 1923 کے شمارے میں ایک مضمون شائع کرایا جس کا عنوان تھا ''ملکانہ راجپوت مسلمانوں کی شدھی''۔ بظاہر یہ مضمون شدھی تحریک کی مخالفت میں تھا اور اس کے شائع ہونے کے بعد شدھی تحریک کے حامیوں نے پریم چند پر انگشت نمائی بھی کی تھی مگر دراصل پریم چند نے اپنے اس مضمون میں شدھی تحریک کو محض مسلمانوں تک محدود رکھنے کی مخالفت کی تھی اور اس دائرے میں عیسائیوں کو بھی شامل کرنے پر زور دیا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا:

''ان کو کیوں نہیں اپناتے جن کے اپنانے سے ہندو قوم کو اصلی قوت حاصل ہوگی۔ کروڑوں اچھوت عیسائیوں کے دامن میں پناہ لیتے چلے جاتے ہیں انھیں کیوں نہیں گلے سے لگاتے۔ اگر آپ قوم کے سچے خیرخواہ ہیں تو ان اچھوتوں کو اٹھائیں، ان پامالوں کے زخموں پر مرہم رکھیں، ان میں تعلیم اور تہذیب کی روشنی پہنچائیں، اعلیٰ اور ادنیٰ کی قیدوں کو مٹائیں۔ چھوت چھات کی بے معنی اور مہمل قیدوں سے قوم کو پاک کیجیے۔ کیا ہماری راسخ الاعتقاد مذہبی جماعتیں ڈوموں اور چماروں سے برادرانہ مساوات کرنے کے لیے تیار ہیں؟ اگر نہیں ہیں تو ان کی شیرازہ بندی کا دعوا باطل ہے۔ آپ یا تو حکّام کی ریشہ

دوانیوں کے شکار ہوگئے ہیں یا مذہبی تنگ نظری نے آپ کی بصارت کو غائب کردیا ہے۔ آپ کو واضح ہو کہ مسلمانوں سے دشمنی کرکے، اپنے پہلو میں کانٹے بوکر آپ اپنی قوم کو مضبوط نہیں کر رہے ہیں۔ آپ مسلمانوں کو جبراً، قہراً حکمراں قوم کی مدد لینے کے لیے مجبور کر رہے ہیں۔ آپ اپنی تلوار مقابل کے ہاتھ میں دے رہے ہیں۔ آپ کا خدا ہی حافظ ہے۔''

مندرجہ بالا الفاظ سے واضح ہے کہ پریم چند اصولاً شدھی تحریک کے مخالف نہیں ہیں بلکہ وہ اسے ایک خاص نہج پر لانے پر زور دے رہے ہیں۔

سوامی شردھانند نے ہری دوار میں گورو کل کانگڑی کے نام سے جو یونیورسٹی قائم کی تھی اس کی ادبی انجمن کے سالانہ جلسے منعقدہ جولائی 1927 کی صدارت منشی پریم چند نے کی تھی اور پورے تین دن وہاں گزارے تھے۔ وہیں پریم چند کے نزدیکی تعلقات پنڈت پدم سنگھ شرما سے قائم ہوئے۔ گورو کل کانگڑی کے طالب علم چندر گپت ودیالنکار کے ساتھ بھی پریم چند کے برادرانہ تعلقات قائم ہوئے جو تاحیات استوار رہے۔

افسوس ہے کہ اس تقریب میں دیا گیا پریم چند کا صدارتی خطبہ بے توجہی کا شکار ہو کر گم ہوگیا۔ مگر پریم چند نے ان تین دنوں کے تاثرات قلم بند کرکے لکھنؤ کے ہندی رسالے ''مادھوری'' کے اپریل 1928 کے شمارے میں بعنوان ''گورو کل کانگڑی میں تین دن'' شائع کرا دیے تھے۔ پریم چند کے اس مضمون کا اردو ترجمہ مہاشے کرشن کی ادارت میں لاہور سے شائع ہونے والے ہفت روزہ ''پرکاش'' کے 22 اپریل 1928 کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ پریم چند نے گورو کل کانگڑی کے تاثرات پر مبنی ایک اور مضمون چار برس کے وقفے کے بعد پنڈت بنارسی داس چترویدی کی ادارت میں کلکتہ سے شائع ہونے والے ہندی ماہنامہ ''وشال بھارت'' کے اگست 1932 کے شمارے میں ''پدم سنگھ شرما کے ساتھ تین دن'' عنوان کے تحت شائع کرایا تھا جو پریم چند کے آریہ سماج سے متاثر ہونے کا واضح ثبوت ہے۔

دلی سے شائع ہونے والے ہندی ماہانہ رسالے ''شدھی سماچار'' کا جنوری۔ فروری 1932 کا مشترکہ شمارہ ''شردھانند شہادت نمبر'' کے طور پر شائع ہوا تھا جس میں پریم چند کا ایک مضمون بعنوان ''سوامی شردھانند اور بھارتیہ شکشا پرنالی'' شامل تھا۔ اس مضمون میں پریم چند نے ہندوستان میں طرز تعلیم کو سوامی شردھانند کی دین پر روشنی ڈالی ہے۔

پریم چند نے اپنے 6 فروری 1913 کے خط میں منشی دیانارائن نگم کو تحریر کیا تھا

''میرے ذمے حمیر پور آریہ سماج کے 10 روپئے باقی ہیں۔ بار بار تقاضہ ہوا ہے مگر اپنی تہی دستی نے اجازت نہ دی کہ ادا کردوں۔ آپ اگر Afford کرسکیں تو براہ راست میرے نام سے حمیر پور آریہ سماج کے سکریٹری کے نام 10 روپئے کا منی آرڈر کردیں۔ ممنون ہوں گا۔ تکلیف تو ہوگی مگر میری خاطر اتنا سہنا پڑے گا کیوں کہ یہاں اب جلسہ بھی عنقریب ہونے والا ہے۔ مکرر عرض یہ ہے کہ یہ 10 روپئے ضرور بھیج دیویں۔ میں نے جنوری میں ادا کرنے کا حتمی وعدہ کیا ہے۔'' (چٹھی پتری جلد 1 صفحہ 17)

اس سے واضح ہے کہ 1913 تک پریم چند باقاعدہ طور پر آریہ سماج سے وابستہ ہو چکے تھے اور آریہ سماج کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے جلسوں اور تقریبوں میں بھی شرکت کرتے تھے۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں انھوں نے لاہور میں آریہ سماج کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے ''آریہ بھاشا سمیلن'' میں شرکت کرنے کی چندر گپت ودیالنکار کی دعوت قبول کرلی اور اپریل 1936 میں لاہور پہنچ کر ایک لاکھ سے زائد سامعین کے روبرو آریہ سماج کی حمایت میں تقریر کی:

''میں تو آریہ سماج کو جتنی دھارمک سنستھا (مذہبی تنظیم) سمجھتا ہوں اتنی تہذیبی سنستھا بھی سمجھتا ہوں۔ بلکہ آپ کشما (معاف) کریں تو میں کہوں گا کہ اس کے تہذیبی کارنامے اس کے دھارمک کارناموں سے زیادہ پرسدھ (مشہور) اور روشن ہیں۔ آریہ سماج نے ثابت کردیا ہے کہ سیوا (خدمت) ہی کسی دھرم کے جیو (زندہ) ہونے کا لکشن (نشان) ہے۔ سیوا کا ایسا کون سا کشیتر (حلقہ) ہے جس میں اس کی کیرتی (شہرت) کی دھوجا (علم) نہ اڑ رہی ہو۔ قومی زندگی کی سمسیاؤں (مسائل) کو حل کرنے میں اس نے جس دور اندیشی کا ثبوت دیا ہے اس پر ہم گرو (فخر) کرسکتے ہیں۔ ہری جنوں کے ادھار (بہبود) میں سب سے پہلے آریہ سماج نے قدم اٹھایا۔ لڑکیوں کی شکشا (تعلیم) کی ضرورت کو سب سے پہلے اس نے سمجھا۔ ورن ویوستھا (طبقہ بندی نظام) کو جنم گت (پیدائشی) نہ مان کر کرم گت (کام سے منسلک) سدھ (ثابت) کرنے کا سہرا اس کے سر ہے۔ جاتی بھید بھاؤ اور کھان پان کے چھوت چھات اور چوکے چولہے کی بادھاؤں (مشکلوں) کو مٹانے کا گورو (فخر) اسی کو پراپت (حاصل) ہے..... ان وچاروں کو جنتا تک پہنچانے کا بیڑا آریہ سماج نے ہی اٹھایا۔ اندھ وشواس اور دھرم کے نام پر کیے جانے والے ہزاروں اناچاروں (بداخلاقیوں) کی قبر اس نے کھودی۔ حالانکہ مردے کو اس میں دفن نہ کرسکا اور ابھی تک اس کی زہریلی دُرگندھ اڑ اڑ کر سماج کو دوشت (خراب) کر رہی ہے۔ سماج کے مانسک (ذہنی) اور بودھک (عقلی) دھراتل (معیار) کو آریہ سماج نے جتنا اٹھایا ہے، شاید ہی بھارت کی کسی سنستھا نے اٹھایا ہو۔ اس کے اپدیشکوں نے ویدوں اور ویدانگوں کے گہن وشیوں (گہرے موضوعات) کو جن سادھارن (عوام الناس) کی سمپتی (ملکیت) بنا دیا۔ جن پر ودوانوں اور آچاریوں کے کئی کئی لیور والے تالے لگے ہوئے تھے..... گورو کل آشرم کو نیا جنم

دے کر آریہ سماج نے شکشا کو سمپورن (مکمل) بنانے کا مہان ادیوگ (کارِ عظیم) کیا ہے۔''

پریم چند کے مندرجہ بالا الفاظ اعلان کر رہے ہیں کہ یہ اس شخص کے منھ سے نکلے ہوئے الفاظ ہیں جو آریہ سماج کے اندازِ فکر سے متفق ہے اور انھی میں سماج اور ملک کی بہتری دیکھتا ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ پریم چند اور آریہ سماج کے اس نزدیکی تعلق کی نسبت ماہرین پریم چند اور پریم چند کے سوانح نگاروں نے خاموشی اختیار کر لی ہے اور کبھی انھیں مارکس وادی، کبھی گاندھی وادی اور کبھی ہندو وادی ثابت کرنے کی کاوشیں کی جاتی ہیں اور آریہ سماج سے متعلق بے شمار ہندی اردو رسائل و جرائد میں شائع ہونے والی پریم چند کی متعدد تخلیقات کی تلاش و جستجو کی جانب مطلق دھیان نہیں دیا گیا۔ مہاشے کرشن کی ادارت میں لاہور سے شائع ہونے والے ہفت روزہ ''پرکاش'' کے 27 اکتوبر 1929 کے شمارے میں پریم چند کی ایک کہانی ''آپ کی تصویر'' شائع ہوئی تھی۔ جس کا ہندی ترجمہ پروفیسر راجندر جگیاسو نے'' آپ کا چتر'' کے عنوان سے 2007 ایک کتابچے کی صورت میں شائع کر دیا تھا۔ اس کا ابتدائی حصہ درج ذیل ہے۔

لوگ مجھ سے کہتے ہیں تم بھی مورتی پوجک ہو۔ تم نے بھی تو سوامی دیانند کی تصویر اپنے کمرہ میں لگا رکھی ہے۔ مانا تم اسے جل نہیں چڑھاتے اس کو بھوگ نہیں لگاتے۔ گھنٹہ نہیں بجاتے۔ اسے اسنان نہیں کراتے۔ اس کا شنگار نہیں کرتے۔ اس کا سوانگ نہیں بناتے۔ لیکن اسے سنسکار تو کرتے ہی ہو۔ اس کے سامنے سرِ تسلیم تو جھکاتے ہی ہو۔ کبھی کبھی مالے پھولوں سے بھی اس کی تعظیم کرتے ہو۔ یہ پرستش نہیں تو اور کیا ہے؟ جواب دیتا ہوں کہ صاحب اس تعظیم اور پرستش میں فرق ہے۔ بہت بڑا فرق ہے۔ میں اسے اپنے کمرہ میں اس لیے نہیں لٹکائے ہوئے ہوں کہ اس کے درشن سے میری نجات ہوگی۔ میں تناسخ کی قیدوں سے آزاد ہو جاؤں گا۔ محض اس کی صورت دیکھنے سے میرے سارے پاپ ڈھل جائیں گے۔ یا میں انھیں خوش کر کے اپنا مقدمہ جیت جاؤں گا۔ یا دشمن پر فتح پا جاؤں گا یا اور کسی طریقہ سے میرا دینی یا دنیاوی مقصد حل ہو جائے گا۔ میں اسے صرف اس وجہ سے اپنے کمرہ میں لٹکاتے ہوئے ہوں۔ کہ سوامی جی کی زندگی کا اعلیٰ معیار پاکیزہ معیار، ہمیشہ میری آنکھوں کے سامنے رہے۔ جس وقت اہلِ دنیا کے برتاؤ سے دل بیزار ہو۔ جس وقت ترغیبات سے قدم میں لغزش ہو یا انتقام کی خواہش سینہ میں موجزن ہو۔ یا زندگی کی کٹھن منزلیں ہمت کو پست کرنے لگیں، اس وقت اس مقدس صورت کے درشنوں سے دل بیقرار کو سکون ہو۔ پائے ثبات قائم رہے اور عفو و تحمل کے راستہ پر چل سکیں اور میں تجربہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ اس تصویر سے مجھے فیض پہنچا ہے۔ اور ایک بار نہیں کئی بار۔

پریم چند کے صاحبزادے امرت رائے صاحب کو یہ کہانی گوپال کرشن مانک ٹالا صاحب نے 1991 میں مہیا کرا دی تھی مگر انھوں نے اس کی اشاعت پر دھیان نہ دیا لیکن یہ کہانی پروفیسر راجندر جگیاسو جی نے 2003 میں کتابچے کی صورت میں شائع کرا دی تھی تب اس کے بعد شائع ہونے والے'' کلیاتِ پریم چند'' (24 جلد) اور'' پریم چند رچناولی'' (20 جلد) میں اس کے شامل نہ ہونے میں کیا مصلحت ہے؟ ڈاکٹر کمل کشور گوئنکا کی ادارت میں 2005 میں شائع شدہ مجموعے'' پریم چند کی اپراپیہ کہانیاں'' میں بھی یہ کہانی شامل نہیں ہے۔

ایک صاحب نے ہندی میں'' پریم چند پر آریہ سماج کا پربھاؤ'' عنوان سے تحقیقی مقالہ لکھ کر پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری حاصل کی ہے۔ مگر یہ مقالہ کتابی صورت میں تا حال شائع نہیں ہوا ہے۔ پریم چند اور آریہ سماج کے باہمی تعلقات اور پریم چند پر آریہ سماج کے اثرات کو سمجھنے کے لیے ان کے زمانے کے آریہ سماج سے متعلق ہندی اردو رسائل و جرائد کا بغور مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ تاکہ پریم چند کی زندگی کے ایک فراموش کردہ باب کو ادبی دنیا کے سامنے لایا جا سکے اور'' آپ کی تصویر'' جیسی پریم چند کی گمشدہ تخلیقات سے شائقین پریم چند روشناس ہو سکیں۔

□□□

پتہ:
46-B, New Mandi,
Muzaffarnagar-251001

● بچوں کی صلاحیتیں ان کی مادری زبان سے ابھرتی ہیں۔
گھروں میں بہتر اردو تعلیم کا انتظام کیجیے۔
اردو کی نئی نسل کو تیار کرنا ہم سب کا فرضِ اولیں ہے۔

ابرار رحمانی

غالب کا ایک متنازعہ خط

غالب کی شاعری جتنی مقبول ہے، اتنے ہی غالب کے خطوط ہر دل عزیز ہیں۔ غالب کی شاعری کی طرح غالب کے خطوط میں بھی نئے نئے نکتے نکلتے رہتے ہیں۔ اس بات پر تقریباً سب کا اتفاق ہے کہ غالب حسن طلب کا بہترین شاعر ہے۔ غالب کے خطوط میں بھی اس کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔ اسی بنیاد پر ہمارے بزرگ دوست ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے غالب کے ایک خط پر سوالیہ نشان لگایا تھا، جس کے متعلق غالب نے لکھا تھا کہ وہ کسی اور سے یہ خط لکھوا رہے ہیں۔ حالاں کہ اس خط کی تحریر اور املا کو دیکھتے ہوئے امتیاز علی عرشی جیسے محقق نے تصدیق کردی تھی کہ غالب کا یہ خط بخط غیر ہے۔

چوں کہ یہ بات دلچسپ ہے اور ہنوز بحث طلب بھی، للہذا اس پوری بحث کو ایک بار پھر پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ یہ بحث انجام کو پہنچے۔ بات اس وقت کی ہے جب خلیق انجم کی مرتبہ کتاب 'خطوط غالب' شائع ہوکر منظر عام پر آئی تھی اور اس میں شامل ایک خط پر کمال احمد صدیقی نے ایک بحث کھڑی کردی۔ 15 دسمبر 1987 کو انجمن ترقی اردو کے ترجمان '' ہماری زبان'' میں کمال احمد صدیقی کا ایک مختصر مضمون شائع ہوا'' کیا 5 جون 1868 کا خط واقعی بخط غیر ہے؟'' کمال صاحب نے لکھا:

'' غالب کے سلسلے میں ہماری تحقیق ایک ہی طرح کے نکات اپنی زبان اور اپنے اسلوب میں بیان کرنے کے دائرے میں محصور ہوگئی ہے۔ جلد سوم میں صفحہ 1305 پر نواب کلب علی خاں کے نام 'بخط غیر' لکھوایا ہوا یہ خط ہے۔ کتاب میں صفحہ 1256 پر یہ خط نمبر 68 کے تحت درج ہے۔ حواشی کے تحت صفحہ 1403 پر یہ اظہار ہے: 'عرشی صاحب نے اس خط کے بارے میں اطلاع دی ہے کہ غالب نے خود یہ خط نہیں لکھا' کسی اور سے لکھوایا ہے۔ لکھنے والے نے '' دل جمعی'' کو '' دل جمی'' لکھا ہے۔

کمال عرض کرتا ہے کہ یہ خط نستعلیق میں خود غالب نے اپنے قلم سے لکھا ہے اور دل جمی کا املا جان بوجھ کر غلط لکھا ہے: عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام۔ اس خط کا عکس کوئی بیس برس پہلے پرتھوی چندر کے '' مرقع غالب'' میں دیکھ چکا تھا۔ اگرچہ وہ کتاب بھی آفسیٹ سے چھپی تھی لیکن حروف اتنے شارپ نہیں تھے۔ شاید نگیٹو شیشے پر بنایا گیا ہوگا۔ مکاتیب غالب (مرتبہ: امتیاز علی خاں عرشی) میں بھی متن اور ان کا اظہار کہ یہ خط کسی اور سے لکھوایا گیا ہے، دیکھ چکا تھا۔ ڈاکٹر خلیق انجم کی کتاب میں اس خط کا عکس دیکھا تو یہ غالب کی تحریر لگا۔ حروف' دائروں' جوڑوں اور اسلوب نگارش کا تجزیہ کیا تو یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ واقعی غالب کی تحریر ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کا نستعلیق خط کتنا اچھا تھا۔ اے کاش! غالب نے اپنا کلام خود اس خط میں لکھا ہوتا۔ حیرت ہے کہ خلیق انجم نے متنی تنقید پر اہم کام کیا ہے لیکن اس نکتے پر ان کی نظر بھی نہیں گئی۔ مخطوطہ شناسی کا دعویٰ میں بھی نہیں کرتا۔ پاکستان میں مشفق خواجہ' ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور جمیل جالبی اور ہندوستان میں ڈاکٹر نذیر احمد' ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی' ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی اور انصار اللہ نظر اس فن پر عبور رکھتے ہیں۔ تفصیل سے تو میں الگ سے اس کے بارے میں لکھوں گا' یہاں چند اشارے کروں گا۔

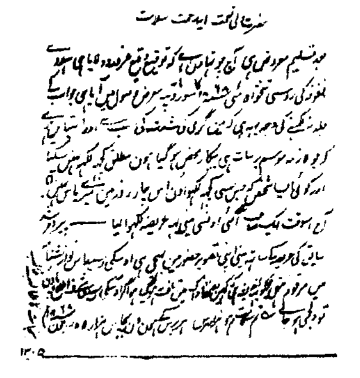

غالب کا متنازعہ خط

1. القاب کے ساتھ سلامت بنا کر لکھا گیا ہے لیکن آخری سطر میں یہ لفظ انھوں نے اپنے مانوس اسلوب میں لکھا ہے۔ (حالاں کہ 8 جنوری کے خط میں (ص 39) سطر 11 میں بھی سلامت ایسا ہی ہے)، 2. شروع کے دائرے بنا کر لکھے ہیں لیکن آخر میں پھر اپنے اسلوب پر آگئے ہیں، 3. 'کے' میں کاف کا مرکز اور 'ے' کا زاویہ وہی ہے' جو ان کے مانوس اور مخصوص طرز نگارش میں ہے، 4. نون کے نقطوں کا مقام وہی ہے' جو ان کا مخصوص اسٹائل ہے، 5. 'کچھ' اور 'لکھ' جیسے الفاظ بالکل ویسے ہی ہیں' جو ان کی اور تحریروں میں ہیں، 6. یاء معروف بھی اسی طرح کئی جگہ ہے' جیسے وہ عام طور پر لکھتے تھے، 7. 'کیا' جیسے وہ لکھتے تھے' اس پر سے کاف کا مرکز ہٹادیں تو اس سے خط کا 'لیا' ہو بہو ہوجاتا ہے۔

یہ چند اشارے ہیں۔ تفصیل سے اس کے بارے میں پھر عرض کیا جائے گا۔ ڈاکٹر خلیق انجم کے مرتب کئے ہوئے خطوط غالب کے حوالے سے جہاں درست متن سامنے آیا ہے' وہاں ایک یہ نہایت اہم بات بھی سامنے آئی ہے اور

یہ ایک خوش گوار اتفاق ہے کہ اس کی دریافت کی سعادت میرے حصہ میں آئی"۔

چوں کہ بحث غالب سے متعلق تھی اور کمال احمد صدیقی کے مطابق "یہ ایک نہایت اہم بات ہے" چناں چہ ناچیز بھی اس بحث میں شامل ہوگیا کیوں کہ مجھے غالب کا یہ خط واقعی بخط غیر لگا تھا۔ میری معروضات 8 جنوری 1988 کے "ہماری زبان" میں شائع ہوئیں۔ میں نے لکھا تھا:

"15 دسمبر 1987 کے "ہماری زبان" میں کمال احمد صدیقی نے غالب کے خط 'بخط غیر' سے متعلق ایک نیا گوشہ تو نہیں' البتہ نیا شوشہ ضرور چھوڑا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تحقیق کی وادی بڑی پرخار ہے' جہاں قدم پھونک پھونک کر رکھنا پڑتا ہے۔ ذرا غافل ہوئے اور کانٹوں نے فوراً لہولہان کیا۔ کمال احمد صدیقی کی حالت بھی یہاں کچھ ایسی ہی نظر آتی ہے۔ انھوں نے اپنے 'دعوے' کے حق میں سات اشارے پیش کیے ہیں اور اپنی بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان ساتوں اشاروں میں کتنا وزن ہے' ایک عام تحقیقی ذہن رکھنے والا بھی پرکھ سکتا ہے۔

یہاں سب سے پہلے اس بات کی اصلاح کرلینی چاہیے کہ یہ خط 5 جون کا نہیں بلکہ 15 جون کا ہے۔ خط کے عکس میں واضح طور پر اسے دیکھا جاسکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ مضمون کے ساتھ دیے گئے تین خطوں میں سے صرف دو خطوط غالب کے خودنوشتہ ہیں۔ تیسرا بہرحال 'بخط غیر' نہیں تو 'متنازعہ' ضرور ہے۔ لہٰذا جب تک ثابت نہیں ہوجاتا' اسے خودنوشتہ کہنا مناسب نہ ہوگا۔

آیئے! اب ہم یہ دیکھنے کی کوشش کریں کہ کمال احمد صدیقی نے جو سات اشارے دیے ہیں' ان کی حقیقت کیا ہے؟ آیا ان کی بات میں وزن بھی ہے؟ اس سلسلے میں ایک عام سی بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ کسی ایک شخص کی تحریر کا دوسرے فرد کی تحریر سے ہوبہو ملنا اور ایک سا دکھائی دینا کوئی بڑی بات نہیں۔ عام طور سے یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض ہم جماعتوں کی تحریریں یا کسی استاد اور اس کے شاگرد کی تحریریں ملتی جلتی ہوتی ہیں۔ گرچہ ہم اسے قاعدہ کلیہ نہیں کہہ سکتے مگر بارہا ایسا دیکھنے میں آیا ہے۔

اب جہاں تک غالب اور ان کے شاگرد یا دوست کی بات ہے تو غالب جیسے عظیم شاعر کی چند باتوں کی نقل کرنا بعید از قیاس نہیں۔ بلکہ ایسا کرتے ہوئے لوگ فخر بھی محسوس کرتے رہے ہوں گے۔ چناں چہ یہ کہنا کہ یہ خط غالب کا ہی ہے' کسی دوسرے صاحب کی تحریر نہیں' خواہ مخواہ کی بات لگتی ہے۔ پھر بھی ہم ان اشاروں پر نظر ڈال لیں تو بہتر ہوگا۔

1. غالب نے سلامت کو "سلامت" اور "سلامت" دونوں طرح سے لکھا ہے۔ مگر جہاں کہیں اس دوسرے انداز میں "سلامت" لکھا ہے' جسے کمال صاحب نے غالب کا مانوس اسلوب کہا ہے' وہاں "مت" کے "ت" کو "سلا" کے "لا" کے اوپر بالکل درمیان میں لکھا ہے جب کہ اس متنازعہ خط میں "سلا" "مت" کے "م" کے فوراً بعد لکھا ہے۔ اس باریک فرق کو تحقیقی نظر بخوبی پرکھ سکتی ہے۔
2. دائرے دار حروف ہر جگہ گول لکھے گئے ہیں جب کہ غالب کی تحریر میں عام طور پر "ن" اور "ی" کو کھینچ کر اور لمبا کر کے لکھنے کا رجحان نظر آتا ہے۔ (کبھی کبھی گول بھی لکھا گیا ہے)۔ مذکورہ خط میں کہیں بھی "ن" اور "ی" کو کھینچ کر نہیں لکھا گیا ہے۔ مثال کے لیے تینوں خطوط کے صرف شعر ہی دیکھیں۔ غالب کے ہاں شعر میں "ہوں" اور "دن" کھینچ کر لکھے گئے ہیں جب کہ خط "بخط غیر" میں دونوں بنا کر اور گول لکھے گئے ہیں۔
3. "کے" میں کاف کا مرکز اور "ے" کا زاویہ عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہ بات صرف غالب کے ساتھ مخصوص نہیں کہی جاسکتی۔
4. نون کے نقطوں کا مقام "ن" کے پیٹ میں ہوتا ہے' جو بلاتخصیص غالب اور سب کے یہاں یکساں ہوتا ہے۔ ہاں البتہ غالب نے "ن" کو کھینچ کر لکھا ہے جو ان کا مانوس اسٹائل ہے جب کہ متنازعہ خط میں پوری طرح گول ہے۔
5. 'کچہ' اور 'لکہ' عمومی انداز میں لکھے ہوئے ہیں۔ غالب کے زمانے میں ہکاری آواز والے لفظ لکھنے کا عام رواج یہی تھا۔ لیکن غالب کے یہاں عام طور پر 'کچہ' اور 'لکہ' میں 'ھ' کی شکل 'ہ' سے قریب اور کہیں کہیں متصل ہے۔ جب کہ مذکورہ خط میں کچھ اور لکھ دونوں لفظوں میں 'ھ' کی شکل کو واضح طور پر 'ہ' سے الگ دیکھا جاسکتا ہے۔ ان میں باقاعدہ فصل موجود ہے۔
6. یائے معروف اس خط میں ہر جگہ بالکل عام انداز میں لکھی گئی ہے۔
7. 'لیا' اور 'کیا' میں خاص اسلوب کی تلاش مشکل معلوم ہوتی ہے۔

یہ تو تھے کمال احمد صدیقی کے اشاروں کے جواب۔ اب میں چند ثبوت اس خط کے 'بخط غیر' ہونے کے حق میں پیش کرتا ہوں۔

مذکورہ خط میں ایک بات جو خاص طور سے نظر آتی ہے' وہ یہ ہے کہ اکثر مقامات پر نقطے اور رموز اوقاف وغیرہ چھوٹے ہوئے ہیں' جو خط کے کاتب کی لاپرواہی کی نشان دہی کرتے ہیں۔ نقطے کہیں کہیں غالب کے یہاں بھی غائب ہیں لیکن اس کثرت سے نہیں جیسا کہ اس خط میں ہیں۔ مندرجۂ ذیل الفاظ میں نقطوں کا چھوٹنا اور دوسری غلطیاں ملاحظہ کریں:

1. القاب میں 'یہ' کے ساتھ غالب ہمیشہ 'ۂ' لکھنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ مذکورہ خط میں ہمزہ (ء) غائب ہے۔
2. تیسری سطر میں لفظ 'روپیہ' میں 'ی' کے نقطے غائب ہیں۔ غالب نے سو روپیہ یعنی جمع کے ساتھ 'روپیہ' نہیں 'روپے' لکھا ہے جیسا کہ 8 جنوری

کے خط اور غالب کے دوسرے خط سے ظاہر ہے جب کہ اس خط میں سو کے ساتھ روپیہ لکھا ہوا ہے۔

3. تیسری سطر میں ہی 'میں' کے 'نون' میں نقطہ غائب ہے جب کہ غالب نقطہ کے ساتھ لکھنے کا اہتمام کرتے تھے۔

4. چوتھی سطر میں 'سبب' کے 'ب' کا نقطہ غائب ہے۔

5. چوتھی ہی سطر میں 'کہ' غالب کے مخصوص اسٹائل میں نہیں ہے۔ غالب 'کہ' کو 'کہ' لکھتے تھے۔ 13 اگست 1866 کا خط اور دوسرے خطوط میں 'کہ' ملاحظہ فرمائیں۔

6. ساتویں سطر میں 'صاحب' کے 'ب' کا نقطہ غائب ہے۔

7. ساتویں سطر میں 'میں نے' کو ملا کر 'مینے' لکھا گیا ہے۔ غالب کے زمانے میں 'میں نے' 'ان نے' 'اس نے' کو ملا کر 'مینے' 'انے' اور 'اسنے' لکھنے کا رواج ضرور تھا لیکن غالب نے ان الفاظ کو الگ الگ ہی لکھنے کا اہتمام کیا ہے۔ غالب کے 13 اگست کے خط میں 'میں نے' الگ الگ لکھا ہوا دیکھا جا سکتا ہے۔

8. 'عریضہ' میں 'ض' کا نقطہ غائب ہے۔

9. 'بھیجی' میں 'ج' کا نقطہ غائب ہے۔

10. ڈاک کے 'ڈ' کا 'ط' غائب ہے۔ غالب کے زمانے میں 'ط' کی جگہ پر '..' کا بھی استعمال عام تھا لیکن غالب نے 'ڈ' اور 'ڑ' پر خاص طور سے 'ط' ہی استعمال کیا ہے۔

11. 'نہ' میں نون کا نقطہ غائب ہے۔

12. 'دلجمعی' کو 'دلجمی' لکھنا کاتب خط کے لاپروا اور شاید جاہل ہونے کی دلیل ہے نہ کہ غالب نے جان بوجھ کر اس کا املا غلط لکھا۔

13. شعر کے برس میں 'ب' کا نقطہ غائب ہے۔

14. مذکورہ خط میں دو مقامات پر 1868 مرقوم ہے اور دونوں ہی میں 18 اور 68 کے درمیان نہ صرف واضح فصل ہے بلکہ دونوں ہی جگہ 68 اوپر اور 18 نیچے لکھا گیا ہے۔ غالب کے یہاں کہیں کہیں فصل تو ہے لیکن بلا وجہ ہندسوں کو اوپر نیچے نہیں لکھا گیا ہے۔ ہاں البتہ جہاں کو ترچھا کر کے 1853 لکھا گیا ہے' وہاں ہندسے اوپر نیچے ہو گئے ہیں۔ مثال کے لیے خطوط غالب مرتبہ خلیق انجم کے ص 242 کا خط ملاحظہ فرمائیں۔

15. غالب نے جہاں ہجری اور عیسوی تاریخ دونوں ایک ساتھ لکھی ہیں' وہاں عیسوی کا 'ء' ڈالا ہے لیکن عام جگہوں پر اس کا اہتمام نہیں کیا ہے۔ جب کہ مذکورہ خط میں عیسوی کا 'ء' واضح ہے"۔

میرے ان معروضات کے جواب میں یکم فروری 1988 کے" ہماری زبان" میں کمال احمد صدیقی کا جواب الجواب شائع ہوا۔" ہماری زبان" کے اسی شمارے میں عابد پیشاوری کا بھی ایک مضمون شائع ہوا' جو کم و بیش میرے اٹھائے گئے نکات کے مطابق ہی تھا۔ عابد پیشاوری کے اس جواب سے جہاں میرے موقف کو تقویت حاصل ہوئی تھی' وہیں کمال احمد صدیقی کا جواب مجھے مطمئن نہیں کر سکا۔

"ہماری زبان" کے یکم فروری 1988 کے شمارے میں عابد پیشاوری نے لکھا:

"......بہر حال اب چند باتیں کمال صاحب کے مزید غور و فکر کے لیے عرض کی جاتی ہیں۔

(1) عاشق ہونے اور معشوق فریبی کی صفت کے باوجود کمال صاحب یہ قطعیت سے کس بنیاد پر کہتے ہیں کہ" غالب نے ......دلجمی کا املا جان بوجھ کر غلط لکھا ہے"۔ شاید وہ یہ سوچتے ہیں کہ تاخیر سے رسید بھجوانے کے فرضی عذر کو ثابت کرنے کے لیے غالب نے ایسا کیا۔ لیکن یہاں یہ امر توجہ طلب ہے کہ کیا نواب کلب علی خاں کو غالب کا یہ پہلا خط تھا؟ نہیں۔ غالب اس سے پہلے بھی کئی خط لکھ چکے ہوں گے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ نواب کلب علی خاں غالب سے کچھ رنجیدہ بھی تھے۔ کیا وہ غالب کے دستخط نہ پہچانتے ہوں گے؟ اگر انھیں ذرا سا بھی شک ہو جاتا کہ غالب صریحاً جھوٹ بول کر انھیں فریب دینے کی کوشش کر رہے ہیں تو ان سے بعید نہیں تھا کہ وہ ناراض ہو کر وظیفہ ہی بند کر دیتے۔ کیا غالب اتنا بڑا خطرہ مول لے سکتے تھے؟ میرا خیال ہے کہ تمام تر تضاد بیانوں کے باوجود غالب کی ہر بات کو جھوٹ فرض کر لینا زیادتی ہوگی۔ اگر تھوڑی دیر کو یہ تسلیم کر لیا جائے کہ زیر بحث خط غالب نے اپنے قلم سے لکھا تو بھی لغزش قلم کے امکان کو یکسر نظر انداز کر دینا بھی مناسب نہیں۔ غالب کی تحریروں میں لغزش ہائے قلم کی مثالیں نادر نہیں ہیں۔

یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ سب سے پہلے مولانا عرشی مرحوم نے لکھا تھا کہ غالب نے یہ خط خود نہیں لکھا۔ عرشی مرحوم نہ صرف ماہرین غالب میں تھے بلکہ مخطوطہ شناسی میں بھی ماہر تھے۔ غالب کے سواد خط سے واقف تھے۔ انھوں نے صرف 'دلجمی' کے املا کی بنیاد پر یا خود غالب کے قول کے پیش نظر یہ بات نہیں کہہ دی ہوگی۔

(2) القاب کے ساتھ" سلامت" اور آخری شعر میں" سلامت" کے انداز میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ یہاں اس نکتہ کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ایک دور اور ایک علاقے میں خوشنویسی کی تعلیم پانے والوں کے انداز تحریر میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ سب کے ہاں دائرے اور کششیں کم و بیش ایک ہی انداز کی ہوتی ہیں۔ یہاں تک بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ اگر

کوئی شعوری طور پر کسی کے خط کی نقل کی مشق کرے تو خطوں میں امتیاز مشکل ہو جاتا ہے۔ دور کیوں جایئے خود ہمارے دور میں ایسی مثالیں ہیں۔ صرف میں پچیس سال پہلے کی خواجہ احمد فاروقی 'ڈاکٹر گوپی چند نارنگ' ڈاکٹر نثار احمد فاروقی اور ہربنس لال نارنگ کی تحریریں دیکھیے تو ایک کے خط کو دوسرے کے خط سے الگ کرنا مشکل ہو جائے گا۔ نثار اور نارنگ صاحب کے خط اب بہت بدل گئے ہیں۔ ہربنس لال نارنگ کی کوئی تحریر میں نے گذشتہ پچیس برس سے نہیں دیکھی۔ اس لیے اس کی بابت کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اگر کسی کے پاس پچیس سال پہلے کی ان سب حضرات کی تحریریں ہوں تو ملا کر دیکھ لیں' میرے قول کی تصدیق ہو جائے گی۔ بہرحال کمال صاحب کے نظریے نے ماہرین اور پرستارانِ غالب کو ایک نیا نکتہ فراہم کر دیا ہے۔ اب انھیں اس شخصیت کی تلاش کرنی چاہیے' جس سے غالب نے بقول خود یہ خط لکھوایا تھا۔

(3) جہاں تک شروع میں دائروں کو بنا کر لکھنے اور بعد میں اپنے اسلوب پر لوٹ آنے کا تعلق ہے' اس پر مزید غور کی ضرورت ہے۔ مثلاً 1868 والے خط میں الفاظ کے دائرے کہیں بھی بعینہ غالب کی دوسری تین تحریروں جیسے نہیں' ہر جگہ مختلف ہیں۔ کیا شروع' کیا آخر میں۔ مثلاً غالب کی اپنی تحریروں میں دائرے کچھ نکیلے' لمبوترے اور چپکے ہوئے ہیں جب کہ 'بخطِ غیر' میں ایسا نہیں۔ ایک فرق تو بہت واضح ہے، غالب کے ہاں 'ی' ہو یا 'ق' اور 'س' ہر جگہ دائرے کا آخری سرا نہ صرف زیادہ نکیلا ہے بلکہ عموماً ہر جگہ لفظ کے ابتدائی حصے سے اوپر کو بڑھا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن 'بخط غیر' والے دائرے زیادہ گول ہیں اور ان کا آخری سرا نہ زیادہ شارپ ہے نہ ابتدائی حصے سے بڑھا ہوا۔ برس' بھیجی' ہی' نہیں، سب میں ایک سا انداز ہے اور یہ خصوصیت ایسی ہے کہ اگر کوئی بنا کر لکھنے کی کوشش کرے تو پھر اسے یہ دس سطری خط لکھنے میں دس گھنٹے لگ سکتے ہیں بشرطیکہ وہ پہلے سے اس کی مسلسل مشق نہ کرتا رہا ہو۔

(4) 'ن' کے نقطوں کے 'اسٹائل' کو بھی کمال صاحب نے بغور ملاحظہ نہیں فرمایا۔ غالب کی تحریروں میں یہ نقطہ 'ن' کے آخری سرے کے ساتھ بیشتر تو مل جاتا ہے یا عین اس کے اوپر آتا ہے۔ مثلاً غزل کے مطلعے میں' نکتہ چیں' اور مقطعے میں 'نہیں' دوسرے' تیسرے اور چوتھے شعر میں نقطہ اگرچہ دائرے کے آخری سرے سے ملا ہوا نہیں ہے لیکن بالکل اس کی نوک کے اوپر ہے۔ نیم دائروں میں البتہ یہ وسطِ دائرہ میں ہے۔ لیکن 'بخط غیر' کی سطر 3 میں 'میں' سطر 4 میں 'ہوں' سطر 5 میں 'اون' (یہاں یہ نون کے پہلے سرے سے قریب ہے) چھٹی سطر 'میں' شعر میں 'ہون' 'دن' اور جون' ہر جگہ نقطے کا مقام وہ نہیں' جو غالب کی غزل یا دوسرے خطوں میں ہے۔

(5) 'کچھ' اور 'لکھ' بھی بالکل ویسے نہیں جیسے غالب نے لکھے ہیں۔ یہ املا تو خیر اس دور سے مخصوص ہے' سب' کچہ' اور 'لکہہ' ہی لکھتے تھے۔

(6) یائے معروف کی بابت مجھے کچھ نہیں کہنا۔ 3 میں دائروں کی بناوٹ کی تفصیل آ گئی ہے اور وہی یائے معروف پر بھی صادق آتی ہے۔

کمال صاحب کا آخری اشارہ سمجھ میں نہیں آ سکا۔ لیکن کاف اور گاف کے مرکز کی بابت مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ غالب کی تحریر میں 'کے' کیا' گستاخی' وغیرہ میں یہ مرکز اپنے مقام اتصال حرف سے کچھ پیچھے کی طرف نکلے ہوئے ہیں۔ دوسرے ان سب کا زاویہ نسبتاً Acute ہے۔' ز' اور خط بالکل سیدھے ہیں۔ کہیں کہیں یہ مرکز اگلے حرف کے مقام اتصال سے ذرا سا اوپر ہے۔ یعنی دونوں میں بہت خفیف سا فاصلہ ہے۔ لیکن بخط غیر میں زیادہ تر یہ مرکز اگلے حرف کے جوڑ سے الگ رہتا ہے اور یہ فاصلہ زیادہ ہے جیسے خود میں نے 'الگ' میں لکھا ہے۔ مثلاً سطر 2 'کی' سطر 3 'کی کے' گرمی کی' شدت کی سطر 4 'لکہہ' سکتا' سطر 5 لکھوا لون' سطر 6 'گئی' سطر 8 'کہ' کہیں' صرف سطر 6 میں 'لکھوا لیا' میں یہ مرکز مقام اتصال سے کچھ پیچھے کو نکل گیا ہے' جیسے غالب کی دوسری تحریروں میں نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ ایسی مثالیں بھی ہیں' جہاں مرکز اگلے حرف سے بالکل ملا ہوا ہے۔ لیکن ان سب کششوں میں ایک خاصیت ایسی ہے' جو غالب کی دوسری تینوں تحریروں میں نہیں۔ مثلاً 'بخط غیر' میں جتنے مرکز ہیں' ان کا زاویہ اول تو اتنا Acute نہیں' دوسرے یہ تمام مراکز درمیان میں خمیدہ لگتے ہیں' ز'۔

(7) 'بخط غالب' تینوں تحریروں میں 'ڑ' اور 'ڈ' پر ہر جگہ 'ط' موجود ہے۔ 'ٹھ' کو البتہ غالب نے چار نقطوں سے لکھا۔ مثال کے طور پر خط 1866 سطر ا بڑھاپے' سطر 6 'ڈاک' ہنڈوی' سطر 7 'ہنڈوی' سطر 8 ڈاکمین' سطر 10 'ڈاکمیں' سطر 12 'ہنڈوی' غزل شعر 4 'پڑا' خط 1867 سطر 8 لڑکوں' ہر جگہ 'ط' موجود ہے۔ لیکن 'بخط غیر' سطر 2 میں 'ہندوی' اور سطر 9 'داک' دونوں جگہ 'ط' نہیں ہے۔ کمال صاحب نے اس باب میں کچھ نہیں فرمایا۔ کیا یہ بھی غالب نے جان بوجھ کر کیا ہے؟ اسی کے ساتھ 'اس چار روز میں میرے پاس نہیں آتا' کو بھی شامل کر لیجیے۔ فقرہ 'آیا' کا متقاضی ہے۔ یہاں صاف 'آتا' لکھا ہے۔ اب یہ لغزشِ قلم ہے یا دانستہ؟

(8) ایک اور امر کی طرف بھی توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جن تین تحریروں کا عکس بخط غالب شامل مضمون ہے' انھیں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب عادتاً اور التزاماً ہر نون میں نقطہ لکھتے ہیں خواہ وہ تلفظ میں آئے یا نہ آئے۔ مثلاً خط 1866 میں 'ن' پر ختم ہونے والے الفاظ

بالترتیب یہ ہیں: لوں' لکھوں' برسوں' میں' ہوں' میں' ڈاکیں' میں' کریں' ڈاکیں' میں' ہوں' نہیں' جوں' میں' ہوں'' ہوں' دن۔
خط 1867: 'وہاں' وہاں' میں' میں' جوابیں' ہوں' میں' ہوں' میں' میں' نہیں' نہیں' دونوں' ہوں۔ غزل: نکتہ چیں' جہاں' میں' ہوں' ہیں' آئیں' اونہیں' یوں' نہیں' ان سب الفاظ میں نون کا نقطہ موجود ہے۔ اب بخط غیر کو دیکھیے۔ سطر 3 میں' 5 نہیں' 6 نہیں' 9 میں۔ ان میں نون کا نقطہ نہیں ہے۔ لیکن سطر 4 مَیں' 5 ہوں' 6 لکھواؤں مَیں' 8 میں' 9 کہیں' پاؤں' 10 ہوں۔ ان سب میں نون کا نقطہ موجود ہے' جس کا مطلب ہے کہ کاتب نون کو ہمیشہ ایک روش پر لکھنے کا عادی نہیں ہے۔

میں کمال صاحب سے ان کی دریافت کی سعادت چھیننے کا خواہش مند ہوں نہ مجاز۔ چوں کہ وہ اس موضوع پر تفصیل سے لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں' اس لیے گزارش ہے کہ مفصل لکھنے سے پہلے ان معروضات پر ایک بار پھر غور فرمالیں۔

پس نوشت: مضمون کا عنوان ہے' کیا 5 جون 1868 کا خط واقعی' بخط غیر' ہے؟' معلوم نہیں یہ عنوان کمال صاحب نے قائم کیا ہے یا ادارہ'' ہماری زبان'' نے۔ خط زیر بحث پر جو تاریخ ہے' وہ 15 جون ہے۔ اب اگر عنوان میں پانچ سہو کاتب نہیں ہے تو پھر مصنف عنوان کو اس تاریخ کی بھی تصحیح کر دینی چاہیے۔ ایک امر یہ بھی توجہ طلب ہے کہ بخط غالب دونوں خطوں میں 1866 اور 1867 اسی طرح لکھے ہوئے ہیں لیکن 1868 کے ساتھ اتنا بڑا عین موجود ہے اور یہ بات دوسری تحریروں سے میل نہیں کھاتی۔ اس پر بھی مزید غور کی ضرورت ہے۔ نیز اس پر بھی نظر رہے کہ' نجات کا طالب غالب' خود غالب کے ہاتھ کی تحریر ہے اور قلم بھی مختلف ہے۔ 'ذکی' کے سلسلے میں لغزش قلم کا ذکر ہو چکا ہے۔ اس خط میں کئی جگہ نقطے نظر نہیں آتے۔ ایک آدھ جگہ جہاں نقطوں کی ضرورت نہیں' وہاں بھی نقطے لگ گئے ہیں۔ مثلاً ملفوفہ' پر ملفوقہ اور سابق' پر' سایق' کا گمان ہوتا ہے۔ سب کو' سب' لکھا گیا ہے۔' پاس' یاس ہے۔' آج' آج'' بھیجی' بھیجی' 'نہ' اور' برس' برس باقی دونوں خطوں اور غزل میں کہیں ایسا نہیں ہوا۔ یہ سب نقطے جان بوجھ کر چھوڑے گئے ہوں گے۔ یقین نہیں آتا''۔

یکم فروری 1988 کے'' ہماری زبان'' کے اسی شمارے میں میری معروضات کا جواب ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے اس طرح دیا:

''8رجنوری 1988 کے'' ہماری زبان'' میں جناب ابرار حسین رحمانی کا مضمون' غالب کا متنازعہ خط واقعی بخط غیر ہے' پڑھا۔ جو باتیں میں 15 دسمبر کے'' ہماری زبان'' میں عرض کر چکا ہوں' انھیں دہرانا تحصیل حاصل ہوگا۔ قارئین اور خاص طور سے فاضل مقالہ نگار جناب ابرار حسین رحمانی کی خدمت میں کچھ باتیں گزارش کرنا چاہتا ہوں تاکہ بقول موصوف' عام تحقیقی ذہن' رکھنے والے میری معروضات کو پرکھ سکیں:

1. رحمانی صاحب نے درست لکھا ہے کہ زیر بحث خط 15 جون کا ہے 5 جون کا نہیں۔ سرخی میں تاریخ کی غلطی سہو کتابت ہے اور اسے میرے کھاتے میں نہ ڈالیں تو عنایت ہوگی۔
2. ایک شمارے میں نمونے کے لیے صرف چند عکس ہی دیے جا سکتے تھے۔ اگر فاضل رحمانی صاحب نے ذرا سی زحمت اور گوارا فرمائی ہوتی اور خلیق انجم کے مرتب کیے ہوئے خطوط غالب کی تیسری جلد میں صفحہ 1262 سے صفحہ 1308 تک غالب کے خطوں کے عکس ملاحظہ فرمائے ہوتے (ایک صفحہ پر دو دو خط بھی ہیں) تو انھیں مبینہ بخط غیر کا سلامت دو جگہ ص 1262' دو جگہ 1265' ایک جگہ ص 1271 پر بھی مل جاتا۔ تحقیق میں سہل انگاری یا شارٹ کٹ سے کام نہیں چلتا۔ فاضل رحمانی صاحب جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں ہیں اور خلیق انجم کی مرتب کی ہوئی کتاب اس یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود ہے۔ اگر موصوف نے یہ صفحات ملاحظہ فرمانے کی زحمت گوارا فرمائی ہوتی تو دیکھتے کہ 15 فروری 1866 کا جو خط (نمبر 18) صفحہ 1286 پر ہے' اس کے القاب میں 'آیہ رحمت' ہمزہ کے بغیر ہے' اور اس خط کے بارے میں کوئی شک نہیں کہ یہ غالب کی تحریر ہے۔ اس طرح وہ اس نکتے پر بھی تکیہ نہیں کرتے کہ جمع کے صیغے میں روپئ ی کے ساتھ لکھتے تھے۔ ۃ کے ساتھ روپیہ نہیں۔ خط نمبر 6 (صفحہ 1265) میں انھوں نے دیکھا ہوتا کہ غالب نے لکھا ہے..... '' سو روپیہ کے ہنڈوی معتمد کے حوالے کی گئی' اسی طرح خط نمبر 14 (صفحہ 1269) میں غالب نے لکھا ہے..... '' عرض کرتا ہوں کہ سو روپیہ کے ہنڈوی بابت مصارف ماہ نومبر 1859 پہنچے''۔ اگر غالب کی تحریریں رحمانی صاحب نے ملاحظہ فرمائی ہوتیں تو اپنی بے پناہ تحقیقی صلاحیتیں اس پر اصرار کرنے میں ضائع نہ کرتے کہ غالب کہ نہیں بلکہ کہ ؟ لکھتے تھے۔ خط نمبر 3 (صفحہ 1263) میں پہلی سطر میں ہی گیارھواں لفظ 'کہ' ہے۔ اسی صفحے پر خط نمبر 2 کا جو حصہ ہے' اس کی تیسری سطر میں' مدعا اس تحریر سے یہ ہے کہ اگر وہ لفافہ نہ پہنچا ہو.....'' مثالیں اور بھی بہت سی ہیں۔ جو لوگ غالب کے مزاج سے آشنا ہیں' وہ جانتے ہیں کہ انھیں ایک صورت پر قرار نہیں تھا۔ ساتواں نکتہ فاضل مقالہ نگار نے یہ ابھارا ہے..... '' ساتویں سطر میں' میں نے' ملا کر' مَینے' لکھا گیا ہے۔ غالب کے زمانے میں مَیں نے' ان نے' اس سے کو ملا کر مینے' انے' اسے ملا کر لکھنے کا رواج ضرور تھا لیکن غالب نے ان الفاظ کو الگ الگ ہی لکھنے کا اہتمام کیا ہے''۔ شاید اس حقیر کے 15 دسمبر کے مضمون میں موصوف نے پہلی بار غالب کی تحریر کے عکس دیکھے ہیں۔ اتنے اور

اپنے پر گفتگو موضوع سے غیر متعلق ہے۔ مینے سب حروف مجتمع خط نمبر 3 (صفحہ 1262) دسویں سطر میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ عبارت ہے ''مینے بطریق اطلاع ......''۔ حالاں کہ ساتویں سطر میں دونوں لفظ 'میں نے' الگ الگ بھی اسی خط میں ہیں۔ رہ گئی نہ ملا کر لکھنے کا اہتمام تو ڈاکیں (ڈاک میں) نکلیگا (نکلے گا) بیگمصاحبہ (بیگم صاحبہ) اور بھی بہت سے لفظ مل سکتے ہیں۔ فاضل مقالہ نگار ابرار حسین رحمانی کو چوں کہ غالب کی تحریروں سے شغف پیدا ہو گیا ہے' اس لیے اگر وہ مناسب سمجھیں تو خلیق انجم کی کتاب کے علاوہ مرقع غالب اور بیاض غالب۔ تحقیقی جائزہ' میں بھی غالب کی تحریروں کے عکس ملاحظہ فرمالیں۔ نسخۂ عرشی میں بھی انھیں کچھ مل جائے گا۔ کسی لائبریری میں طاہر ایڈیشن مل جائے تو اس میں بھی ایک ورق مل جائے گا۔ اپنے زمانۂ طالب علمی میں (طالب علم تو خیر میں اب بھی ہوں مطلب ہے آغاز طالب علمی) میں 37 کے آس پاس غالب کی تحریر کا پہلا عکس طاہر ایڈیشن میں ہی دیکھا تھا۔

جناب ابرار رحمانی نمبر 14 کے تحت لکھتے ہیں: 'مذکورہ خط میں دو مقامات پر 1868 مرقوم ہے اور دونوں ہی میں (کذا) 18 اور 68 کے درمیان نہ صرف واضح فصل ہے بلکہ دونوں ہی جگہ واضح طور پر 68 اوپر اور 18 نیچے لکھا گیا ہے۔ غالب کے یہاں کہیں کہیں فصل تو ہے لیکن بلاوجہ ہندسوں کو اوپر نیچے نہیں لکھا گیا ہے۔ ہاں البتہ جہاں سنہ ترچھا کر کے 1853 لکھا گیا ہے' وہاں ہندسے اوپر نیچے ہو گئے ہیں''

فاضل مقالہ نگار کا مشاہدہ بالکل درست ہے لیکن تحقیق میں صرف مشاہدہ' اپنی غیر معمولی اہمیت کے باوجود سب کچھ نہیں۔ ایک تو ـــــ خط مستقیم میں نہیں لکھا جاتا۔ ـــــ اس طرح لکھا جاتا ہے کہ بڑی کشش پر جو کرسی اوپری سطح پر ہوتی ہے' پورا سال لکھا جاتا ہے اور کرسی کے نیچے کا جو شوشہ ہوتا ہے' اس پر 'ھ' یا 'ء' لکھا جاتا ہے۔ لیکن غالب کا اسلوب یہ ہے کہ 'ھ' یا 'ء' کی جگہ پر صدی اور کشش پر دھائی اور اکائی لکھتے ہیں اور 'ھ' یا 'ء' سنہ کے بعد ملاحظہ فرمائیں صفحہ 1263 پر دوسرے خط کا آخر۔ ص 1264 پر چوتھے خط کا اختتام ص 1267 پر نویں خط کا اختتام (قطعہ سے قبل) اس سے صفحے پر دسویں خط کا اختتام۔ ص 1269 پندرھویں خط کا اختتام ص 1271 پر 18 ویں اور 19 ویں خطوں کے اختتام۔ باقی ہر جگہ بھی یہ غالب کی روش خاص ہے۔ بعینہ اس طرح اس مبینہ بخط غیر لیکن دراصل بخط غالب مراسلے میں 1868 لکھا گیا ہے۔ میں ابرار حسین رحمانی صاحب کا بے حد شکر گزار ہوں کہ اگرچہ انھوں نے میرے موقف کے ابطال میں دلیل پیش کی لیکن اس کی وجہ سے سنہ لکھنے کی غالب کی روشِ خاص واضح ہوئی' جس پر پہلے میری نظر نہیں گئی تھی۔ میں نے اپنے موقف کے حق میں سات دلیلیں پیش کی تھیں۔ سنہ میں 'ھ یا ء' کی جگہ صدی لکھنا غالب کا مخصوص اسلوب ہے اور اسے آٹھویں دلیل تصور فرمایا جائے۔

جناب ابرار حسین رحمانی صاحب نے بعض جگہ نقطوں اور ہمزہ کا چھوٹ جانا یا چھوڑ دینا یا دائروں وغیرہ کی جو بات کی ہے' تو وہ 'ذہنی' کی طرح جان بوجھ کر ہے۔ دائروں کو جان بوجھ کر دوسری طرح لکھنے سے خط کا کردار نہیں بدلتا۔ خط کا کردار غالب کا ہے۔ یوں بھی وہ شیفتہ آمیز نسخ نستعلیق لکھتے تھے۔ اس میں شعوری طور پر نستعلیق بنایا لیکن پھر بھی اصل کی طرف واپس آئے۔ خط کا کردار نہیں بدلا''۔

یکم فروری 1988 کی کمال صاحب کی اس تحریر کے بعد میں منتظر رہا کہ شاید اس بحث کو دیگر ماہرین غالب اور باشعور قارئین بشمول خطوط غالب کے مرتب ڈاکٹر خلیق انجم آگے بڑھائیں گے اور یہ بحث کسی حتمی انجام کو پہنچے گی لیکن وقت گزرا اور بات آئی گئی ہو گئی۔ تقریباً پندرہ سال بعد خلیق انجم کا ایک مقالہ بعنوان 'غالب کے جعلی خطوط' پروفیسر نذیر احمد کی مرتبہ کتاب 'غالب کی مکتوب نگاری' میں شائع ہوا' جس میں ڈاکٹر خلیق انجم نے ڈاکٹر کمال احمد صدیقی کے اس مضمون کے تعلق سے صرف ایک جملہ لکھا کہ'' اس مسئلہ پر ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے'' ہماری زبان'' میں بہت اہم مضمون لکھا ہے' جس میں انھوں نے ان خطوط کو جعلی ثابت کیا ہے''۔ جب کہ اپنے اسی مضمون کے حوالے سے خلیق انجم نے کمال احمد صدیقی کو ایک خط مورخہ 17 اپریل 2003 مطبوعہ '' غالب اور رام پور'' شائع شدہ غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی میں لکھا تھا '' میں نے مقالہ میں اس خط کا بھی ذکر کیا تھا جو غالب نے 15 جون 1868 کو نواب کلب علی خاں کے نام لکھا تھا''۔

کمال احمد صدیقی نے اس خط کو اپنے مضمون '' غالب کا ایک خط'' میں شامل کیا ہے جو'' غالب اور رام پور'' میں شامل ہے۔ افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ جب ناچیز نے خلیق انجم کا مضمون '' غالب کے جعلی خطوط'' کا مطالعہ کیا تو مذکورہ بالا ایک جملے کے سوا کچھ اور نہ ملا اور وہ بھی غلط اطلاع پر مبنی کیوں کہ نہ تو کمال احمد صدیقی نے اور نہ ہی ناچیز ابرار رحمانی نے غالب کے 15 جون 1868 کے اس خط کو جعلی کہا تھا بلکہ کمال احمد صدیقی' ابرار رحمانی اور عابد پیشاوری کے مابین صرف اس بات پر بحث چلی تھی کہ غالب کا یہ خط بخط غالب ہے یا بخط غیر۔ آج ایک بار پھر اس بحث کو از سر نو اٹھانے کا مقصد اس بحث کو انجام تک پہنچانا ہے کہ خطوط غالب اپنے عہد کی اہم دستاویز ہیں۔

□□□

پتہ:
Tazeen Apartment,
179/22, Zakir Nagar,
New Delhi-25

سرور الہدیٰ

خلیل الرحمٰن اعظمی اور نوائے ظفر

''نوائے ظفر'' پہلی بار انجمن ترقی اردو ہند سے 1975 میں شائع ہوئی تھی۔ اس کا تازہ ایڈیشن 2008 کے اہتمام پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے شائع کی ہے۔ یہ کتاب بنیادی طور پر بہادر شاہ ظفر کے کلام کا انتخاب ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے 34 صفحے کا مقدمہ تحریر کیا ہے جس میں کلام ظفر کے استناد اور اس کے تعین قدر کے سلسلے میں کچھ مسائل زیر بحث آئے ہیں۔ گذشتہ چند برسوں میں بہادر شاہ ظفر پر جو تنقید لکھی گئی اس میں تمام اہم لکھنے والوں نے ''نوائے ظفر'' کے مقدمے کا حوالہ دیا ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کا اصل مقصد بہادر شاہ ظفر کے اس شعری متن کو تلاش کرنا تھا جو ان کا اصل تعارف ہو۔ وہ اپنے مقدمے کو غیر ضروری طور پر طول دینا نہیں چاہتے تھے۔ متن کے استناد کا مسئلہ خاصا مشکل ہوتا ہے۔ یہاں محض تنقیدی اصولوں کی واقفیت سے کام نہیں چلتا۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے بہادر شاہ ظفر کے کلام کو جس توجہ سے پڑھا تھا وہ اس مقدمے سے ظاہر ہے۔ انھوں نے ظفر کے ناقدین اور محققین کو دو خانوں میں تقسیم کیا ہے پہلے کا تعلق اس موقف سے ہے کہ بہادر شاہ ظفر کا کلام ذوق کا مرہون منت ہے۔ اس موقف کی بنیاد محمد حسین آزاد نے ''آب حیات'' میں ڈالی تھی۔ دوسرا حلقہ ان حضرات کا ہے جو بہادر شاہ ظفر کے کلام کو ذوق کا مرہون منت نہیں مانتے۔ ان دو خانوں میں جن محققین اور ناقدین کو تقسیم کیا گیا ہے وہ اپنے زمانے کے اہم ترین لوگ تھے اور یہ پہلا موقع ہے جب ان تمام محققین کی آرا کو ایک ساتھ درج کرنے کے بعد ان سے کچھ نتائج برآمد کیے گئے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے ان آرا سے جو بحث کی ہے اس میں جذباتیت کا کوئی عنصر نہیں ہے۔ انھوں نے کلام ظفر کے بعض نمونوں کو شک کی نظر سے دیکھا ہے مگر وہ مشکوک کلام کو بھی ایک حساس قاری کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کی اس تحقیقی اور تنقیدی حساسیت سے واضح ہے کہ وہ اس نوا کے متلاشی ہیں جس کے بغیر بہادر شاہ ظفر کی شناخت ممکن نہیں ہے۔ یہی وہ نوا ہے جس میں خود خلیل الرحمٰن اعظمی کو اپنی آواز کا سراغ ملا تھا۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے اپنے شعری مجموعے ''نیا عہد نامہ'' کے دیباچے میں کلیات میر سے اپنی دلچسپی اور قربت کا جس طرح اظہار کیا ہے اس کا تعلق چند تشبیہات، استعارات کے برتنے سے نہیں بلکہ شعری مزاج اور اس کی داخلی دنیا سے ہے۔ نوائے ظفر کے دیباچے میں انھوں نے بہادر شاہ ظفر سے اپنے شخصی اور مذاقی رشتے کا تذکرہ نہیں کیا ہے مگر یہ محسوس ہوتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر کی شاعری کا ایک منتخب حصہ ان کی ذات سے بہت قریب ہے۔ ظفر کی شاعری کا یہ منتخب حصہ خلیل الرحمٰن اعظمی کا مرکز نگاہ ہی نہیں بلکہ مرکز ذات بن جاتا ہے۔ وہ اس حصے کی تعبیر و تشریح میں صرف ذہانت کا نہیں بلکہ دردمندی کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ وہ ان لفظوں کے پیچھے ایک ایسی شخصیت کا المیہ دیکھتے ہیں جو نہایت کسمپرسی کے عالم میں جی رہا ہے۔ بہادر شاہ ظفر کی جس آواز نے خلیل الرحمٰن کو آواز دی تھی اسے منطقی طور پر سمجھا نہیں جاسکتا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ متن بھی مسلسل گردش میں رہتا ہے اور اسے کسی ایسے قاری کی تلاش رہتی ہے جو اس کا محرم راز ہو۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کا یہ دیباچہ اس قدر اہمیت کا حامل نہیں ہوسکتا تھا اگر اس میں متن کو گہری دردمندی کے ساتھ نہ دیکھا جاتا۔ بہت سے لوگ بہادر شاہ ظفر کی شاعری کے استناد پر عالمانہ گفتگو کے باوجود اس نوائے ظفر سے کوسوں دور رہے ہیں جو ہمیں خلیل الرحمٰن اعظمی کے یہاں سنائی دیتی ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے اپنے مقدمے کی ابتدا یوں کی ہے:

''ظفر وہ بدنصیب شاعر ہے جس کا کلیات دراصل اس کا مدفن ہے۔ چار دواوین پر مشتمل یہ ضخیم کلام ایک ہفت خواں ہے کہ جس کا سر کرنا لانا ہے جوئے شیر کا۔ آئندہ اوراق میں اسی کی کوشش کی گئی ہے۔ غالب کے شعروں کے انتخاب نے انھیں رسوا کیا تھا۔ ظفر کا یہ انتخاب ظفر کو روشناس کرانے کی ایک عقیدت مندانہ کاوش ہے۔'' (نوائے ظفر ص-111)

بظاہر تو اس اقتباس میں کوئی علمی اور دانشورانہ نکتہ نہیں ہے مگر اس آئینے میں ہمارے دور کا چہرہ شرمندہ ہوتا ہے۔ بہادر شاہ ظفر کا دیوان پڑھنا گویا جوئے شیر لانا ہے۔ غالب کو شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا تھا۔ یہ دونوں باتیں یہاں بے وجہ نہیں آئی ہیں۔ غالب کو جب شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا تھا تو کسی اور کی تخصیص کیا ہے۔ مگر خلیل الرحمٰن اعظمی ظفر کے انتخاب کی ذمے داری اپنے سر لیتے ہوئے اپنی عاجزی کا اظہار کرتے ہیں کہ یہ ظفر کو روشناس کرانے کی عقیدت مندانہ کاوش ہے۔ اس سے بہتر جواز اس انتخاب کا کیا ہوسکتا ہے۔ تنقید میں عقیدت مندی کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے لیکن خلیل الرحمٰن اعظمی نے 1975 میں ظفر کے تعلق سے اپنی اس عقیدت مندی کا اظہار کیا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دیباچے میں عقیدت مندی کا لفظ استعمال کرنے کے باوجود وہ بہادر شاہ کے محاکمے میں نہایت معروضی رویہ اختیار کرتے ہیں۔ تو سوال یہ ہے کہ پھر عقیدت مندانہ کاوش کا مطلب کیا ہے۔ اصل میں خلیل الرحمٰن اعظمی کی اس عقیدت مندانہ کاوش کو بہادر شاہ کے شعری متن میں گہری دلچسپی کا نام دینا چاہیے اور گہری دلچسپی ہمیشہ تاثراتی یا عقیدت مندانہ اظہار ہی کی شکل

میں ظاہر نہیں ہوتی۔ کم سے کم خلیل الرحمٰن اعظمی نے یہ ثابت کردیا ہے کہ تنقید میں عقیدت مندی کا مطلب وہ نہیں ہے جیسا کہ سمجھا جاتا ہے۔ ظفر سے عقیدت مندی کا سبب ہر شخص کے نزدیک مختلف ہوسکتا ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے ظفر کی کلیات کو ان کا مدفن قرار دیتے ہوئے انھیں بدنصیب شاعر بھی کہا ہے۔ اس بیان کے پیچھے دراصل بہادر شاہ ظفر کے المیہ کے ساتھ ساتھ اس کا ضخیم دیوان بھی رہا ہے۔ لوگ ادھر ادھر سے کچھ پڑھ لیتے ہیں اور نوائے ظفر تک ان کی رسائی نہیں ہو پاتی۔ سب سے پہلے خلیل الرحمٰن اعظمی کے دیباچے کا وہ حصہ دیکھیے جس کا تعلق کلام ظفر کے استناد سے ہے:

''اوپر جو رائیں درج کی گئیں، ان میں سے سوائے حسرت اور فراق کے کسی اور نے یہ بتانے کی کوشش نہیں کی کہ وہ آخر کون سا انداز ہے جس کی بنا پر ہم ظفر کو شاہ نصیر اور ذوق سے الگ کرکے انھیں ایک منفرد شاعرانہ حیثیت دے سکتے ہیں۔ حسرت اور فراق، ظفر کے کلام میں جس سوز وگداز، خلوص، شاعرانہ احساس اور اداسی، درماندگی کا ذکر کرتے ہیں وہ کلیات ظفر کی تمام غزلوں سے مترشح نہیں ہوتی بلکہ کوئی شخص سرسری طور پر ظفر کا دیوان الٹ پلٹ کر دیکھے تو اسے زیادہ تر سنگلاخ زمینوں، مشکل قافیوں، انوکھی ردیفوں اور محاورہ بندی اور زبان دانی والی غزلیں ملیں گی۔ یہی خصوصیت شاہ نصیر اور ذوق کی بھی ہے اور آزاد نے جس نوع کے کلام کو اپنے استاد سے منسوب کیا ہے اس کے بنیادی عناصر یہی ہیں۔'' (نوائے ظفر، ص-1)

خلیل الرحمٰن اعظمی نے دو بنیادی سوال قائم کیے ہیں، ایک تو یہ کہ آخر وہ کون سا ایسا انداز ہے جو بہادر شاہ ظفر کو شاہ نصیر اور ذوق سے الگ کرتا ہے اور محمد حسین آزاد نے ان کے جس کلام کو ذوق سے منسوب کیا ہے اس کی نوعیت کیا ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی اس نوائے ظفر کے متلاشی ہیں جو بہادر شاہ ظفر کی اصل شناخت ہے۔ حسرت اور فراق نے ظفر کے کلام کی جن خوبیوں کو اہمیت دی ہے ان کا اطلاق ظفر کی پوری شاعری پر نہیں ہوتا۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے نوائے ظفر کی تلاش میں سنگلاخ زمینوں، مشکل، قافیوں، محاورہ بندی اور زبان دانی سے صرف نظر تو نہیں کیا مگر انھیں محسوس ہوتا ہے کہ ظفر کے شعری مزاج سے زیادہ یہ خصوصیات شاہ نصیر اور ذوق سے مخصوص ہیں۔ وہ شاہ نصیر اور ذوق کے اسلوب کو ظفر کا بنیادی اور اصل اسلوب قرار نہیں دیتے۔ اس سلسلے میں انھوں نے جو دلیلیں دی ہیں انھیں رد بھی نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن ایک ادب کا طالب علم یہ سوال کرسکتا ہے کہ ظفر کے کلام سے متعلق محمد حسین آزاد اگر شکوک وشبہات پیدا نہ کرتے تو بہادر شاہ ظفر کی زبان والی شاعری کے ساتھ ہمارا رویہ کیا ہوتا ہے۔ کیا ہم ظفر کے کلام کو مختلف اسالیب میں تقسیم کرکے دیکھتے اور کیا بہادر شاہ ظفر کو ان کے تمام اسالیب کے ساتھ نہیں دیکھا جاسکتا۔ ان سوالوں کا جواب تو خلیل الرحمٰن اعظمی کے دیباچے سے نہیں مل سکتا البتہ اس کی روشنی میں ان کے ادبی ذوق اور نظریۂ شعر کو بہتر طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔ کسی شاعر کو ہم کیوں پڑھتے ہیں اس کا ایک جواب تو یہ ہوسکتا ہے کہ وہ ہنرمند شاعر ہے۔ مگر اس انتخاب میں خود ہمارے ذوق شعری کا بھی دخل ہوتا ہے۔ نصابی ضرورت کے تحت ناسخ اور ذوق کو پڑھنا اور پڑھانا کچھ اور ہے اور ان شعرا کو اپنی داخلی اور حسی ضرورتوں کی بنیاد پر پڑھنا کچھ اور ہے۔ ناسخ اور ذوق کی ہنرمندیوں کو کچھ لوگ مشرقی شعریات کا حصہ قرار دے کر کہتے ہیں کہ شاعری کو داخلی اور حسی ضرورت کی بنیاد پر پڑھنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ شاعری کو پرکھنے اور دیکھنے کا پیمانہ یہ ہے کہ وہ کس حد تک اپنی شعریات اور رسومیات پر پوری اترتی ہے۔ اصل میں مشرقی شعریات کے نام پر ایک ایسی شعری ہنرمندی کا سبق پڑھایا جاتا رہا ہے جس میں شخصی اور سماجی اظہار کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ ہنرمندی اول و آخر ہنرمندی ہے۔ خالص ہنرمندی۔ مشرقی شعریات کے نام پر بہت آسانی سے ہیئت پرستی کا جام پلایا جاسکتا ہے۔ یہ ایسا نشہ ہے کہ انسانی زندگی اور سماج پر جیسی بھی قیامت گزر جائے وہ بات یہیں سے شروع کریں گے کہ دیکھیے یہ رعایت اور مناسبت قائم نہیں ہوسکی۔ مجھے خلیل الرحمٰن اعظمی کا درج ذیل اقتباس پڑھ کر حیرت ہوئی اس لیے کہ انھیں گذشتہ چند دہائیوں میں نقط پرست ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''ظفر کے متعلق ان تمام رایوں پر غور وفکر سے کام لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ حضرات بھی جو محمد حسین آزاد کی رائے سے اتفاق نہیں رکھتے اور ظفر کو حقیقی معنوں میں شاعر اور ان کے کلیات کو انھی کا زائیدۂ فکر سمجھتے ہیں، انھیں بھی ظفر کا سارا سارا کلام پڑھ کر اس کے شاعرانہ اور غیر شاعرانہ عناصر کو الگ کرنے کا موقع نہیں ملا ہے۔ یہ رائیں زیادہ تر رسمی اور اخلاقی طور پر دی گئی ہیں۔ یا ان لوگوں کے سامنے ظفر کی بعض غزلیں صرف نمونۂ کلام کی حیثیت سے آئی ہیں۔ اس لیے کہ اس زمانے کے تذکروں اور انتخابات کی چھان بین کی جائے تو اس میں ظفر کے بہترین اشعار کا کہیں پتہ بھی نہیں۔ ایسے اشعار جو ایک طرف تو ظفر کے درد وکرب کا موزوں اور مؤثر اظہار ہیں، دوسرے ان میں ظفر کا لب ولہجہ اور ان کی آواز اتنی منفرد ہے کہ اس پر نصیر اور ذوق کا کسی طرح دھوکہ نہیں ہوسکتا۔ یہ سب تذکرے اور انتخابات اپنے دامن میں انھی اشعار اور غزلیات کو سمیٹے ہوئے ہیں جو شاہ نصیر اور ذوق کی نہ بھی ہوں تو انھی کی سی معلوم ہوتی ہیں اور ان میں وہی آورد تصنع، کرتب بازی اور بازی گری او رجذبات سے معریٰ موزوں گوئی ملتی ہے جس کا حقیقی معنوں میں شاعرانہ تخلیق سے کوئی تعلق نہیں۔''

یہ بات اہم ہے کہ خلیل الرحمٰن اعظمی ظفر کے تعلق سے شاعرانہ اوز غیر شاعرانہ عناصر کی بات کرتے ہیں۔ شاعرانہ اور غیر شاعرانہ عناصر سے ان کی مراد کیا ہے وہ مندرجۂ بالا اقتباس سے ظاہر ہے اعظمی شعری وفنی ہنرمندی سے

انکار تو نہیں کرتے لیکن ان کی نظر میں جذبات سے عاری ہنرمندی غیر شاعرانہ عناصر کا حصہ ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی یہاں تک لکھ جاتے ہیں کہ تذکروں اور انتخابات میں جس قسم کے اشعار ظفر کے ملتے ہیں وہ شاہ نصیر اور ذوق کے نہ بھی ہوں تو انھی کے سے معلوم ہوتے ہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کی نظر اردو شاعری کے مختلف اسالیب پر بہت گہری تھی اور وہ بخوبی جانتے ہوں کہ وہ جسے تصنع اور آورد کہہ رہے ہیں اس کا بھی ایک علمی و ادبی جواز ہے۔ لیکن وہ یہاں ظفر کے تعلق سے خیال بندی اور زبان کے استادانہ استعمال کو غیر شاعرانہ قرار دیتے ہیں۔ اس شدت کی وجہ شاید یہ ہو کہ ان کی نظر میں ظفر کا وہی کلام بہتر ہے جس میں دل گرفتگی کی کیفیت ہے۔ جذبات سے عاری شاعری کے لیے موزوں گوئی کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ موزوں گوئی کا مطلب ہے شاعری کا سپاٹ اور بے کیف ہونا۔ لیکن لفظی دروبست سے بھی شاعری کو سپاٹ ہونے سے بچایا جاسکتا ہے اور ایسی شاعری بھی زبان و اظہار کی سطح پر ایک لطف دیتی ہے، گو اس کا اثر دیرپا نہیں ہوتا۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کے نزدیک شاعرانہ تخلیق، تخلیقی عمل کی اس بھٹی سے گزر کر آتی ہے جس کے بعد لفظ بولنے اور گنگنانے لگتے ہیں۔ اور اس آنچ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کاغذ جل اور جھلس جائے گا۔ ظفر کے جس کلام میں انھیں یہ آنچ محسوس ہوتی ہے ان کے خیال میں وہی ظفر کی اصل آواز ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میرا خیال ہے کہ سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ آزاد نے جس قسم کے کلام کو ذوق سے منسوب کرنے کی کوشش کی ہے خود اس کی نوعیت کیا ہے اور اگر وہ کلام کسی شاعر کے کلیات میں موجود ہو تو اس کے لیے سرمایۂ افتخار بن سکتا ہے؟ آزاد نے بار بار اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ بادشاہ ردیف قافیے خوب سوچتا تھا اور نئی نئی اور انوکھی زمینوں کا بادشاہ تھا..... میری رائے یہ ہے کہ جس شخص کو ذرا شعر کا مذاق اور اسے ادنیٰ درجے کی موزوں گوئی اور لفظی بازی گری کے مقابل حقیقی شاعری اور تخلیقی عناصر کی پرکھ کا سلیقہ ہے، وہ اگر ظفر کے کلیات کو پڑھنے کی ہمت کرے اور اس نوع کی غزلیں اس کی نظر سے گزریں تو اسے ظفر سے ایک طرح کی نصرت ہو جائے گی..... چوں کہ آزاد کی ذہنی تربیت شاہ نصیر اور ذوق کے دبستان میں ہوئی تھی اور اس وقت زوال پذیر ادبی مذاق حقیقی شاعری سے اپنا رشتہ توڑ کر اس قسم کی استادی اور پہلوانی کو فن کا اعجاز سمجھ رہا تھا۔ (نوائے ظفر، ص 14-13)

یہ اقتباس ان لوگوں کو ضرور دیکھنا چاہیے جو یہ سمجھتے ہیں کہ خلیل الرحمٰن اعظمی نے ترقی پسندی کو ایک لعنت سمجھ کر رد کر دیا تھا۔ ظفر کے سلسلے میں ان کے موقف کو ترقی پسندی ہی کی ایک شکل کے طور پر دیکھا جانا چاہیے۔ وہ ظفر کی تصنع آمیز اور استادانہ رنگ کی شاعری کو اس طرح رد کرتے ہیں جس طرح حالی نے اپنے زمانے اور ماضی قریب کی شاعری کو رد کیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ خلیل الرحمٰن اعظمی ظفر کے تعلق سے یہ نقطۂ نظر کیوں اختیار کرتے ہیں؟ اس کا جواب صرف یہ نہیں ہے کہ خلیل الرحمٰن اعظمی ظفر کی مخصوص لحن کی شاعری کو ان کا اصل شعری سرمایہ سمجھتے ہیں بلکہ خود ان کے نزدیک اصل شاعری کی تعریف بھی یہی ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی استادی اور پہلوانی کے فن کو زوال پذیر ادبی مذاق کا علامیہ قرار دیتے ہیں۔ محمد حسن نے اپنی کتاب ''دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی پس منظر'' میں ایہام گوئی کے رجحان کو زوال پذیر ادبی معاشرے کی پیداوار کہا تھا۔ جس پر آج بھی لوگ معترض ہوتے ہیں کہ ایہام گوئی تو اردو شاعری کا ایک اہم حصہ رہی ہے اسے کسی خاص عہد کی زوال پذیری کا نام دینا درست نہیں۔ حالی اور ان کے رفقا پر یہ الزام آج تک لگایا جاتا ہے کہ ان لوگوں نے اپنے ادبی سرمائے کو حقارت کی نظر سے دیکھا اور یہ نظر نوآبادیاتی ہندوستان نے پیدا کی تھی۔ بنیادی سچائی یہ ہے کہ کوئی متن اپنی مخصوص شعریات کے اندر تشکیل پاتا ہے اور اہمیت اور افادیت کا تعین بھی اسی شعریات اور تہذیبی روایات کی روشنی ہی ہونا چاہیے۔ ان مسائل کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں لیکن خلیل الرحمٰن اعظمی مطالعۂ ظفر میں جس تنقیدی موقف کو اختیار کرتے ہیں۔ اسے روایتی ترقی پسندی نہیں بلکہ نئی ترقی پسندی کا نام دینا چاہیے۔ پروفیسر محمود خاں شیرانی کے مضمون کا خلیل الرحمٰن اعظمی نے اقتباس پیش کرتے ہوئے آغا محمد باقر کے ان کاغذات کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے شیرانی کو عنایت کیے تھے۔ تحقیق کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ آزاد نے کچھ غزلیں کہہ کر دیوان ذوق میں ذوق کے ابتدائی کلام کے عنوان سے شامل کر دیں۔ محمود شیرانی نے کاغذ اور سیاہی کی پوری کیفیت کو دیکھنے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ یہ مولانا حسین آزاد کے زمانے کے ہیں۔ ان کے الفاظ ہیں:

''لیکن سیاہی اور کاغذ پر غور کرنے سے مجھے رائے میں بہت جلد ترمیم کرنی پڑی اور معلوم ہوگیا کہ کاغذات مولانا کے اپنے زمانے کے ہیں۔ چھ کاغذات طالب علموں کی کاپیوں سے لیے ہیں۔ دو کاغذ نارتھ ویسٹرن ریلوے کے مطبوعہ فارم پر ہیں۔ ہلکی اودی روشنائی میں مسودے تیار ہوئے ہیں۔ مجھے جس چیز نے سب سے زیادہ حیران کیا یہ تھی کہ ذوق کی غزلوں کے مسودے حضرت مولانا کے خط میں یہاں کیا کر رہے ہیں۔ آخر مطبوعہ دیوان ذوق میں جو غزلوں کو تلاش کیا، اس میں تمام غزلیں بہ تفاوت قلیل مل گئیں..... آخر یہ رائے قائم کرنی پڑی کہ مولانا نے یہ غزلیں تصنیف کر کے ذوق کے دیوان میں داخل کر دی ہیں۔'' (نوائے ظفر، ص-13)

اس اقتباس کا خلیل الرحمٰن نے بہت اچھا تجزیہ پیش کیا ہے۔ انھوں نے کچھ قیاسی باتیں بھی پیدا کی ہیں جو حقیقت سے قریب معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ خود مولانا حسین آزاد کی شاعری ان کی نثر کے مقابلے میں سپاٹ اور بے کیف تھی۔ سارا جادو ان کی نثر میں ہے۔ لہٰذا خلیل الرحمٰن اعظمی کا یہ خیال

درست معلوم ہوتا ہے کہ ذوق کے طرز کی غزلیں کہنا آزاد کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس لیے وہ سولہ غزلیں لکھنے کے بعد رک گئے۔ وہ لکھتے ہیں:

''چنانچہ ان غزلوں کو بچپن کا کلام کہہ کر دیوان میں شامل کر دیا۔ اس مقصد میں ناکامیابی کے بعد ان کی نظر آس پاس پڑی ہوگی تو سب سے پہلے خود ذوق کے شاگرد ظفر کا کلیات نظر آیا ہوگا۔ اسے آزاد نے الٹ پلٹ کر دیکھا ہوگا تو مجموعی طور پر انھیں یہاں ذوق اسکول کی شاعری کے نمونے ملے ہوں گے۔ پھر یہ افسوس بھی ہوا ہوگا کہ شاگرد کا شعری سرمایہ استاد کے سرمائے پر بھاری ہے اور ایسا استاد جسے آبِ حیات میں اردو کا عظیم شاعر ثابت کرنا ہے اور یہ لکھنا ہے کہ نظم اردو کا ان پر خاتمہ ہوگیا۔ آخر کار آزاد نے ظفر کے کلام کو ذوق کے سپرد کر کے اپنے اس مقصد کی تکمیل کی۔'' (نوائے ظفر، ص-13)

میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ ظفر کا وہ کلام جس پر ذوق کی گہری چھاپ ہے اس کے بارے میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ظفر ذوق کے اسلوب کو بھی برتنے پر پوری طرح قادر ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کی تحقیق سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ظفر کی خیال بندی اور استادانہ مہارت والی شاعری ظفر ہی کی تخلیقی اپج کا نتیجہ ہے۔ لیکن یہ ان کی داخلیت کا حصہ نہیں بن سکی۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کی نگاہ میں ظفر کے اسی کلام کی اہمیت ہے، جس میں ان کا اضطراب خون کی طرح رواں ہے۔ حسین آزاد نے کلیات ظفر کا مطالعہ جس مقصد سے کیا ہوگا اس میں ظفر کی جذبات سے بھری شاعری کے لیے کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ان کی نگاہ میں ذوق کی عظمت کا دارومدار اسی اسلوب کی شاعری پر تھا جسے ہم شاہ نصیر اور ذوق اسکول سے موسوم کرتے ہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں:

''کلیات ظفر کا یہ حصہ آزاد کی دسترس میں نہ آسکا اور نہ اس کا کوئی شعر انھوں نے ذوق کے کلام میں خلط ملط کرنے کی کوشش کی۔ اس لیے ہم اس نتیجے پر پہنچنے کے لیے مجبور ہیں کہ آزاد نے ظفر کے اس سرمائے کو غصب کرنے کی کوشش نہیں کی ہے جو موجودہ ادبی نقطۂ نظر سے ظفر کے لیے مایۂ امتیاز بن سکتا ہے..... اب رہا وہ سرمایہ جسے آزاد نے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا تو اس کی حیثیت سکوں کے اس انبار کی ہے جنھیں زمانے کا مذاق اور شعور کھوٹا ثابت کر چکا ہے۔ یہ سرمایہ ظفر کے لیے باعث ننگ ہے، اس لیے اب اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اسے ظفر کی ملکیت ثابت کرنے میں وقت صرف کیا جائے بلکہ کوئی محقق اگر یہ ثابت بھی کردے کہ یہ سارا کلام ذوق ہی کا نتیجۂ فکر ہے تو یہ ظفر کے حق میں مفید ہوگا۔ ویسے بھی شاعری کے سلسلے میں اس بدمذاقی کی ذمے داری شاہ نصیر اور ذوق پر ہی عائد ہوتی ہے۔'' (نوائے ظفر، ص14)

خلیل الرحمٰن اعظمی بہادر شاہ ظفر کے کلام کے استناد سے متعلق ایک نتیجے تک پہنچنے کے باوجود شاہ نصیر اور ذوق کے اسلوب کو ظفر کے لیے باعث ننگ بتاتے ہیں اور اس قصے کو سمیٹ دینا چاہتے ہیں کہ رنگ ذوق کی نمائندگی کرنے والا کلام ظفر کا ہے یا ذوق کا۔ مندرجۂ بالا اقتباس میں انھیں اس کا بھی خوف نہیں کہ کوئی نقاد کہیں رنگ ذوق والے کلام کو ذوق کا نہ ثابت کر دے۔ اس رنگ اور اسلوب کو وہ بدمذاقی کا نام دیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ خلیل الرحمٰن اعظمی شاہ نصیر اور ذوق کے شعری اسلوب سے اتنے متنفر اور بیزار کیوں ہیں؟ بہادر شاہ ظفر کی شاعری کے ایک مخصوص حصے کی تعریف اور تحسین کے ساتھ ساتھ ذوق اور شاہ نصیر کے اسلوب کی حامل شاعری کو کسی اور طرح سے بھی رد کیا جاسکتا تھا۔ اسے بدمذاقی اور باعث ننگ کہنا کچھ لوگوں کے نزدیک نامناسب ہوسکتا ہے۔ ترقی پسند نقادوں نے ناسخ، شاہ ظفر اور ذوق کے شعری اسلوب کو ایک خاص نظریے کے تحت رد کیا تھا۔ انھیں ادب میں محض کاریگری اور صنائع عزیز نہیں تھی۔ اس کے باوجود محمد حسن نے ایہام گو شعرا کی لفظ پرستی کا جواز یہ کہہ کر پیش کیا تھا کہ اردو شاعری کی نئی نویلی دلہن کو مزید خوبصورت بنانے کے لیے یہ کام ضروری تھا۔ انھوں نے ایہام گوئی کو لفظ کی تہہ داری اور طرفگی کی تلاش کا نام بھی دیا تھا۔ شاہ ظفر اور ذوق کے شعری اسلوب کو ایہام گوئی سے موسوم تو نہیں کیا جاسکتا لیکن آبرو اور ناجی اور نصیر اور ذوق کے یہاں ایک بات مشترک ہے جذب و کیف کا نہ ہونا۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے جذب و کیف سے عاری شاعری کے تعلق سے جو رویہ اختیار کیا ہے وہ ترقی پسند تنقید سے بھی زیادہ سخت ہے۔

''کلیات ظفر سے خس و خاشاک علاحدہ کر دیا جائے تو ڈھائی سو صفحوں کا ایک خوب صورت دیوان نکل آتا ہے۔ ایک ایسا مجموعہ جس پر ظفر کی اپنی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ یہاں ظفر کا لب و لہجہ شاہ نصیر اور ذوق کے دبستان سے نہ صرف یہ کہ الگ ہوجاتا ہے بلکہ تغزل، شاعرانہ کیفیات اور جمالیاتی رچاؤ کے اعتبار سے یہ کلام اردو غزل کے اس سرمائے سے قریب آجاتا ہے جس کی آبیاری میر، قائم، یقین، درد، مصحفی، سوز اور آتش جیسے شعرا نے کی اور جن کے کلام کا منتخب حصہ اپنے اندر ایسی تازگی و دلکشی اور تاثیر رکھتا ہے جس کی اپنی دائمی اقدار ہیں۔ اس حصے میں بھی غالب حصہ اس کلام کا ہے جو ظفر کی آپ بیتی ہے۔'' (نوائے ظفر، ص16)

خلیل الرحمٰن اعظمی نے بہادر شاہ ظفر کے منتخب کلام کو جن شعرا کے ساتھ رکھ کر دیکھا ہے ان کے یہاں بھی شاہ نصیر اور ذوق جیسی شاعری کے کچھ نمونے مل سکتے ہیں۔ شاید اسی حقیقت کے پیش نظر انھوں نے منتخب حصہ کا ٹکڑا استعمال کیا ہے۔ وہ اسی منتخب حصے کو ظفر کی آپ بیتی بھی کہتے ہیں۔ لفظ آپ بیتی کی ترکیب شاعری کے لیے بہت کثرت سے استعمال کی گئی ہے۔ آپ بیتی کو شعر بنانے کا مطلب جگ بیتی بھی ہوسکتا ہے۔ جگ بیتی کو آپ بیتی کا رنگ بھی دیا جاسکتا ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ آپ بیتی یا جگ بیتی کس قدر تخلیقی تجربے کی بھٹی میں پگھل سکی۔ ظفر نے اگر اپنی آپ بیتی کو شاعری بنا دیا ہے تو صرف اسی

سے شاعری اچھی یا بڑی نہیں ہوسکتی، شاعری میں ہم ہزار جذبات و کیفیات پر زور دیں لیکن اس کے استعاراتی نظام کی اہمیت ہمیشہ باقی رہے گی۔ شاعری کا شخصی اور ذاتی قسم کی چیز بن جانا عیب نہیں مگر اس میں جذب و کیف کے ساتھ کسی بصیرت اور آگہی کا عنصر بھی تو ہونا چاہیے۔ ظفر کی شاعری کا استعاراتی نظام معنی کی کتنی جہتوں کو پیدا کرتا ہے، خلیل الرحمن اعظمی کے نزدیک یہ سوال بہت اہم نہیں ہے۔ وہ بہادر شاہ ظفر کے المیہ کردار کو جتنی اہمیت دیتے ہیں اس میں اس بات کی کہاں گنجائش ہے کہ متن کو کسی انجانی دنیا کے سراغ کے وسیلے کے طور پر دیکھا اور پڑھا جائے۔ خلیل الرحمن اعظمی نے ظفر کے جس شعری متن کو ان کی اصل طاقت قرار دیا ہے اس پر شخصیت کی گہری چھاپ ہے۔ یہ شخصیت شاعری سے فاصلہ قائم نہیں کرسکی۔ اور لازماً اس کی معنیاتی دنیا ایک مخصوص فضا سے باہر نہیں آسکی۔ شاعری کو اپنی شخصیت میں اس طرح رچا بسا لینا آسان نہیں مگر اس میں نقصان یہ ہے کہ شاعر اپنی شخصی دنیا سے باہر نہیں آپاتا۔ خلیل الرحمن اعظمی نے ظفر کے المیہ کردار کو ان کی شاعری میں جس دیانت اور دردمندی کے ساتھ تلاش کیا ہے وہ ایک ایسا زاویہ ہے جس پر لوگ اب معترض ہوتے ہیں، لیکن مجموعی اعتبار سے متن کو شخصیت سے الگ کرکے دیکھنا ہمیشہ ٹھیک نہیں ہوتا۔ اگر کوئی متن شخصیت کی طرف ہمیں لے جاتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں، ظفر کی شاعری کو آپ بیتی کا نام دینے کے بعد وہ لکھتے ہیں:

''ظفر یہاں ایک ایسے شخص کے روپ میں نظر آتا ہے جس کی زندگی کا ایک ایک سانس اپنے غموں کی زنجیر سے الجھا رہا۔ ظفر کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

شمع جلتی ہے پر اس طرح کہاں جلتی ہے
ہڈی ہڈی مری اے سوز نہاں جلتی ہے

کہنے کو تو ظفر نے اپنی زندگی کے آخری ایام رنگون کے بالاخانے میں گزارے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی پوری زندگی ایک طرح کی روحانی کشاکش اور جلاوطنی میں گزری۔ ایک مسلسل کچوکے دینے والا عذاب اور ہڈیوں کو پگھلا دینے والا غم اس کی شاعری کا اصل محرک ہے اور اس آگ میں جل کر اس نے جو شعر کہے ہیں وہ ہمارے سامنے ایک زبردست المیہ کردار کو پیش کرتے ہیں۔''

خلیل الرحمن اعظمی کے یہ جملے پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر جملے میں وہی آگ بھر آئی ہے جس سے بہادر شاہ ظفر کی شاعری روشن ہے۔ خلیل الرحمن اعظمی کی تنقیدی بصیرت کا یہ واضح ثبوت ہے کہ وہ مندرجۂ بالا شعر کو پیش کرنے کے بعد ظفر کے قیام رنگون کا واقعہ یاد کرتے ہیں اور انھیں ظفر کی روحانی کشاکش اور ذہنی جلاوطنی کا ادراک بھی ہوتا ہے۔ کسی خاص واقعے کے وسیلے سے زندگی کی ختم نہ ہونے والی روحانی کشاکش کا سراغ پالینا آسان نہیں۔

خلیل الرحمن اعظمی کی تنقید اپنے بہترین لمحات میں تارعنکبوت سے استفادہ کرتے ہوئے ماورائے سخن کی بھی جستجو کرتی ہے۔ انھوں نے ظفر کی خصوصی علامتوں، استعاروں، زنداں، زنجیر، قفس، آشیاں، صیاد، عندلیب کی معنویت کو ظفر کے ذاتی تجربے کی روشنی میں دیکھا ہے۔ ان کا یہ خیال درست ہے کہ زیادہ تر شعرا نے ان استعاروں کو رسمی اور روایتی طور پر استعمال کیا ہے۔ مگر ظفر کے یہاں ان استعاروں پر ذات کا پرتو نظر آتا ہے۔ ظفر کی شاعری سے متعلق انھوں نے کچھ اہم نکتوں کی جانب اشارہ کیا ہے۔:

''ظفر کی یہ حزنیہ شاعری اپنے اندر جو شدت اور المناکی رکھتی ہے، ممکن ہے بہت دیر تک ہم اس کی تاب نہ لاسکیں۔ کیوں کہ کسی شاعر کے نغمے ہمارے لیے اسی وقت گوارا ہوسکتے ہیں جب ہمیں ان کے اندر اپنے دوسرے حواس کی تسکین کا سامان بھی مل سکے۔ ظفر کی زندگی میں جو المناکی اور کشاکش تھی اس نے انھیں اس کا موقع نہ دیا کہ وہ اس زہر غم کو ہضم کرکے ارتفاع حاصل کرسکتے۔ لیکن ظفر نے اس شدت کو کم کرنے کا راستہ ڈھونڈھ نکالا تھا۔ یعنی اپنے جذبات کی گرفت میں رہنے کے بجائے ایک طرح سے انھیں وسعت دینے کی کوشش کی ہے۔ ظفر کو موسیقی اور خطاطی سے لگاؤ تھا ہی، شاعری میں بھی انھوں نے ٹھمری، گیت، بھجن، ہولی وغیرہ کو اپنایا اور ایک طرح سے نرم اور ملائم کیفیات سے اپنے دل پر مرہم رکھنے کی کوشش کی۔'' (نوائے ظفر، ص 26)

ظفر کی شاعری کے حدود اور امکانات کیا ہیں اس مسئلے پر یہاں خلیل الرحمن اعظمی نے معروضی رویہ اختیار کیا ہے۔ ان کی پوری تنقیدی فکر لفظ ''ارتفاع'' میں سمٹ آئی ہے۔ ظفر کی شاعری کو اس عقیدت مندانہ انداز سے دیکھنے کے بعد یہ لکھنا کہ ان کے یہاں دوسرے حواس کی تسکین کا سامان نہیں اور وہ زہر غم کو ہضم کرکے ارتفاع حاصل نہ کرسکے بڑی بات ہے۔ ظفر نے اپنی سمٹی ہوئی دنیا سے نکلنے کی صورت غزل میں نہیں بلکہ گیت، بھجن وغیرہ میں تلاش کی۔ خلیل الرحمن اعظمی بنیادی طور پر ایک تخلیق کار ہیں لیکن تنقید میں بھی ان کے امتیازات اپنی جگہ مسلم ہیں۔ وہ غیر ضروری طور پر مغربی مفکرین کے نام اور ادبی اصطلاحوں سے اپنی تحریروں کو بوجھل نہیں بناتے۔ مطالعۂ ظفر میں انھوں نے جو زاویہ اختیار کیا ہے اسے ہم تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی رویوں کی یکجائی کا نام دے سکتے ہیں۔

□□□

پتہ:
Deptt. of Urdu,
Jamia Millia Islamia
New Delhi-110025

شاہد پٹھان

حلقۂ اربابِ ذوق کے ادبی وانتقادی تصورات

اردو میں ترقی پسند تحریک کے قیام کے کچھ عرصہ بعد 29/اپریل 1939 کو نصیر احمد جامعی اور ان کے دوستوں، نسیم حجازی، تابش صدیقی، محمد فاضل، اقبال احمد، محمد سعید، عبدالغنی اور شیر محمد کے اشتراکِ باہمی سے ''بزمِ داستان گویاں'' کے نام سے لاہور میں ایک ادبی انجمن عمل میں آئی(1) ابتداً اس کی ہفتہ وار مجالس میں افسانے پڑھے جاتے اور ان پر آزادانہ تنقید کی جاتی تھی، لیکن بعد میں قیوم نظر اور یوسف ظفر کے مشوروں سے شاعری کو بھی مجالس کی کارروائی میں شامل کر لیا گیا۔ چنانچہ اس وقت کے کئی نوجوان شعرا حلقے سے وابستہ ہونے لگے، بعد ازاں اتفاق رائے سے اس انجمن کا نام بدل کر ''حلقۂ اربابِ ذوق'' رکھ لیا گیا۔ 25/اگست 1940 سے قیوم نظر کی معرفت میراجی بھی حلقے سے وابستہ ہو گئے۔ انھوں نے حلقۂ اربابِ ذوق کو ترقی پسند تحریک کے متوازی ومتعارض جدید شعری وتنقیدی نظریاتی معیار فراہم کرنے میں بنیادی رول ادا کیا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کے بقول:

''میراجی کی شمولیت کے بعد حلقۂ اربابِ ذوق نے نہ صرف اجتہاد اور ترقی کی طرف قدم بڑھایا بلکہ اس نے ترقی پسند تحریک کی مقصدیت کے خلاف ردعمل بھی ظاہر کیا اور اس کی یکسانیت کے مقابلے میں تنوع پیدا کرنے کی بھی کوشش کی۔ چنانچہ حلقے نے اب ایک ایسی تحریک کی صورت اختیار کر لی جو ادب کی موجودہ حالت کو بدلنے اور فن کے داخلی حسن کو اُجاگر کرنے کا تہیہ کر چکی تھی۔''(2)

ہر چند حلقۂ اربابِ ذوق کا ترقی پسند تحریک کی طرح سے باقاعدہ کوئی منشور نہیں تھا یہ ایک اعتبار سے مختلف الخیال اور انفرادیت پسندوں کی انجمن تھی اور اسی سبب سے اس کی مجالس میں کئی ترقی پسند ادبا وشعرا بھی شرکت کرتے رہے اور ان کی تخلیقات بھی حلقے کے ''منتخبات''، ''بہترین نظمیں'' اور ''نئی تحریریں'' میں شامل کی جاتی تھیں، لیکن اس کے باوجود حلقے کے اپنے انفرادی و امتیازی ادبی معیارات و معتقدات تھے جو ترقی پسندوں سے یکسر مختلف اور متنوع تھے۔ جس طرح سے ترقی پسندوں پر مارکس، لینن اور بعض دوسرے اشتراکیت پسند مفکرین و مبلغین کے اثرات غالب رہے، اسی طرح حلقۂ اربابِ ذوق کے ادبا وشعرا انیسویں صدی کے فرانسیسی اور امریکی رومانوی اور زوال پسند ادبا وحکما مثلاً روسو، وکٹر، ہیوگو، فلابیر، پو، بودلیر، والیئن، ملارمے، رین بو، رومین رولاں کے افکار ونظریات کے اثرات مرتب ہوئے۔ علاوہ ازیں علومِ نفسیات کے ماہرین فرائڈ ایڈلر اور یونگ کے تحلیل نفسی، اجتماعی لاشعور اور احساس کمتری کے نظریات کا اثر بھی حلقے کے شعرا وادبا کی تخلیقات میں جلوہ گر ہے۔ مغرب میں متذکرہ مفکرین کے نظریات سے ابھرنے والی ادبی تحریکات مثلاً رومانویت، تاثریت، علامت نگاری، وجودیت اور سرئیلزم وغیرہ سے بھی حلقۂ اربابِ ذوق کے ادبا مانوس ومتاثر رہے ہیں اور انھوں نے اپنی شاعری کے ساتھ ساتھ تنقیدی مطالعات میں بھی متذکرہ نظریات سے خاطر خواہ استفادہ کیا ہے۔ حلقۂ اربابِ ذوق سے وابستہ جن ادبا وناقدین نے قابلِ ذکر وقدر مطالعات پیش کیے اور اردو تنقید کے دامن میں نئے جہات کا اضافہ کیا ہے، ان میں میراجی، ن۔م۔ راشد، یوسف ظفر، قیوم نظر، مختار صدیقی، ممتاز شیریں، محمد حسن عسکری، ریاض احمد اور آزادیِ وطن کے بعد کے ناقدین میں سید علی عابد، مظفر علی سید، سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر انور سدید وغیرہ خاص کر قابلِ ذکر ہیں۔

ترقی پسند تحریک نے اپنے ادبی مسلک میں، جانبداری، نظریاتی وابستگی، مقصدیت، اجتماعیت اور کسی حد تک اشتراکیت کی تبلیغ و ترجمانی کو بنیادی حیثیت دی تھی۔ اس ادبی ضابطہ بندی سے حلقے والے متفق نہیں تھے۔ چنانچہ انھوں نے ترقی پسندی کے ردعمل میں اپنی ادبی ترجیحات ونظریات میں تخلیقی آزادی وانفرادیت، فنکار کے ذاتی احساس واسلوب، غیر جانبداری اور نظریاتی وابستگی سے انحراف کو خاص اہمیت دی۔ ان کے تخلیقی موقف ومسلک میں ابہام، انفرادیت، داخلیت، جنسیت، نفسیات، وجود کی ہمہ جہت عکاسی اور اسلوب و اظہار کی سطح پر استعاراتی وعلامتی انداز کو تقدم حاصل رہا۔ ذاتی اور کائناتی ہر قسم کے احساس اور تجربے کو انفرادی، جدت آمیز اسلوب میں بیان کرنے کو حلقے والوں نے ہمیشہ مرجح سمجھا ہے۔ حلقے کے نمائندہ ادبا و ناقدین نے اپنی تنقیدوں میں بھی انھی امور کا اہتمام والتزام کیا ہے۔

حلقے کو جدید شعری وتنقیدی معیار ومنہاج فراہم کرنے والوں میں میراجی اور ن۔م۔ راشد خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ ان دونوں نے نئی نظم کی شعریات کی تشکیل اور تفہیم کے سلسلے میں قابلِ لحاظ فریضہ انجام دیا ہے۔ چنانچہ ترقی پسندوں کے طنز وتنقید کے ہدف بھی یہی دونوں شعرا بنتے رہے ہیں۔ ان کی فرانسیسی اور انگریزی خاص کر اشاریت پسند اور انحطاط پسند ادبا وشعرا سے اثر پذیری کی علی سردار جعفری نے سخت الفاظ میں مذمت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''ان کی (حلقے کی) بنیاد یہ تھی کہ ادب کا سماج سے کوئی تعلق نہیں، ان کی رومانیت مجہول اور گندی تھی، یہ خوابوں کو خارجی حقیقت سے الگ کر کے واہمے میں تبدیل کر دیتے تھے اور ان اندھے خوابوں سے ذاتی اور انفرادی تاثرات کی جو جنسی تجربوں تک محدود رہتے تھے، ایک داخلی دنیا بناتے تھے...... دراصل یہ

جاگیرداری اور بورژوائی انحطاط کی گندگی کا بدرو تھا جو بڑے زور شور سے بہا لیکن اس کا بہاؤ اس کی گندگی کو نہیں چھپا سکا۔ انھوں نے قدامت سے بچ کر جدت کی طرف قدم بڑھانے کی کوشش کی اور فرائڈ اور ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی آغوش میں پہنچ گئے۔''(3)

ظاہر ہے کہ سردار جعفری کے یہ خیالات انتہا پسندی پر مبنی ہیں۔ حلقے کے دونوں مرکزی شعرا کی شاعری صرف جنسیت کے حصار میں مقید نہیں ہے۔ میرا جی کے یہاں جنسیت اور ابہام کی لے تیز ہے لیکن راشد کی شاعری اور مضامین میں شعر و ادب کے سماجی شعور کا احساس بھی ملتا ہے۔ البتہ ن ادبا کے یہاں ادبی افادیت کی تبلیغ کا وہ انداز و آہنگ ناپید ہے جو ترقی پسندوں کا خاصہ رہا ہے۔

میرا جی نے اپنے مضامین و مقالات میں شعر و ادب میں تصور، خیال اور موضوع کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے خیال افروزی پر اصرار کیا، وہ ادب کو زندگی کا ترجمان سمجھتے تھے اور بدلتی ہوئی زندگی کے ساتھ ادب میں بھی ارتقا و عروج کے خواہاں تھے چنانچہ 1941 میں رسالہ ''ادبی دنیا'' میں انھوں نے لکھا تھا ''ادب زندگی کا ترجمان ہے اور ظاہر ہے کہ ہماری زندگی ماہ بماہ نہیں تو سال بہ سال ضروری بدلتی جا رہی ہے اور یوں نہ صرف سماجی اور اقتصادی حالات ادب پر اثر انداز ہو رہے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی ذہنی طور پر بھی خصوصاً مغرب سے آئے ہوئے خیالات ادب اور آرٹ میں جہاں فن کاری کے نئے اسلوب قائم کرنے کا باعث ہوئے ہیں، وہاں اخلاقی لحاظ سے بھی ایک جدید انداز نظر قائم ہوتا جا رہا ہے۔ اس لحاظ سے (شعر و ادب) پڑھنے والوں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے...... دوسرا گروہ ایک ذہین اور حساس بچہ ہے جس میں نئی بات کے متعلق ایک فطری ردعمل پیدا ہوتا ہے۔ یہ گروہ اگر چہ تعداد کے لحاظ سے اقلیت میں ہے لیکن اسی کو ہم روح حیات کہہ سکتے ہیں۔ صحیح معنوں میں ترقی پسند۔ کیوں کہ یہ ''کل جدید لذیذ'' کے درست مفہوم کو سمجھتا ہے، قدامت پرستی میں الجھ کر قبول کرنے والی چیزوں کو محض ان کی اجنبیت کے باعث نہیں رد کرتا۔''(4)

ظاہر ہے کہ یہاں میرا جی نے ترقی پسند فکر کی صحیح تعریف بیان کی ہے لیکن ان کی ترقی پسندی کا دائرہ کار اشتراکیت پسند ادبا سے زیادہ وسیع اور وقیع ہے۔ چنانچہ ایک جگہ وہ کہتے ہیں:

''آج کل اردو ادب کے رجحانات روز بروز حقیقت پرستی کی طرف مائل ہوتے جا رہے ہیں۔ حقیقت پرستی کا مدعا یہ ہے کہ زندگی کو اس کے اصل رنگ میں پیش کیا جائے لیکن جس طرح سماجی اصلاح کے آغاز سے بہت عرصے تک محض بچوں کی شادی اور بیواں کی مصیبتوں کا ہی رونا رویا جاتا رہا، اسی طرح حقیقت پرستی کا مطلب بھی ادب و شعر میں محدود ہو کر رہ گیا۔ مزدور کی زندگی اور گناہ گاری کے سستے پہلو کے علاوہ اردو کے ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں کی نظریں اور بہت ہی کم رستوں کی طرف اٹھتی ہیں۔ اس لیے یہ بات کچھ بیجا نہیں معلوم ہوتی کہ مغرب کے ادب کی ان شخصیتوں سے اردو کے دامن کو وسیع کیا جائے جو اچھوتی راہوں پر چلیں اور جنھوں نے نئے خیالات کے لیے اپنی زندگی کو وقف کر دیا۔''(5)

ایک اور مقام پر میرا جی نے صحیح اور نامیاتی ترقی پسندی کی تعریف میں لکھا ہے:

''ترقی پسند تصور کی بنیاد ہم میں سے بعض انسان آج کے مائل بہ مادیت زمانے میں جنیوں کی طرح مفید اور غیر مفید پر رکھ بیٹھے ہیں۔ ترقی پسندی در اصل خیال افروزی کا دوسرا نام ہے۔ جو ادب خیال افروز ہوگا، وہ زندگی کے ہر شعبے میں ہمیشہ ہمیں قدم آگے بڑھانے پر مجبور کر دے گا لیکن اگر ہم زندگی کی وسعت کو بھول کر وقت کے خط میں سے ایک نقطے کو لے کر جزو کو کل سمجھ بیٹھیں گے تو کنوئیں کے مینڈک بن کر رہ جائیں گے۔ اس کے برعکس اگر ترقی پسندی کے صحیح مفہوم کو مشعل بناتے ہوئے ہم خیال افروزی کو مدنظر رکھیں گے، خواہ وہ زندگی کے کسی بھی شعبے سے تعلق رکھتی ہو تو ذہنی اور جسمانی دوڑ میں ہماری پسماندگی کا کوئی سوال ہی نہ پیدا ہو سکے گا۔ چنانچہ نثر اور نظم دونوں اصناف سخن کے متعلق اب تک حلقۂ ارباب ذوق کا نقطۂ نظر یہی رہا ہے اور اس نقطۂ نظر کی وسعت بہ آسانی زندگی سے وہ ہم آہنگی حاصل کر سکی ہے جس کا اظہار آج کی نظموں کا انتخاب بھی ہے۔''(6)

میرا جی نے ان خیالات کا اظہار حلقے کے اولین سالانہ شعری انتخاب میں کیا تھا جس میں حلقے کے علاوہ ترقی پسند شاعروں کی نظمیں بھی شامل تھیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ میرا جی شعر و ادب کا ایک متوازن اور صالح ترقی پسند انداز نظر رکھتے تھے وہ اصلاً خیال میں تنوع اور تازہ کاری نیز اسلوب و اظہار میں انفرادیت و اشاریت کے قائل تھے اور یہی چیزیں انھیں ترقی پسندوں کے یہاں نظر نہیں آتی تھیں۔ جن ترقی پسند شعرا کی تخلیقات میں ذرا بھی فنکاری اور جدید انداز فکر کا انھیں احساس ہوا، انھوں نے ان کی قدر و منزلت کی ہے۔ ان کی کتاب ''اس نظم میں'' کئی ترقی پسند شعرا مثلاً فیض، احمد ندیم قاسمی، جوش اور مطلبی فرید آبادی وغیرہ کی منظومات کے انفرادی تجزیے بھی شامل ہیں اور میرے خیال سے میرا جی کے تجزیے، ہمارے آج کے جدید ترقی پسند نقادوں کے ادبی مطالعات اور فنی تجزیوں سے کسی بھی طرح کم اہمیت نہیں رکھتے۔

ن۔ م۔ راشد بھی شاعری میں انفرادیت، جدت اور تجربے کی گہرائی اور اسلوب و اظہار میں فنکارانہ انفرادیت و اجتہاد کے قائل ہونے کے باوجود سماجی و سیاسی مسائل و حقائق حیات کی ترجمانی کو شجر ممنوعہ قرار نہیں دیتے۔ لیکن میرا جی کی طرح راشد بھی ترقی پسندوں کی فارمولہ بازی، یکسانیت اور نعرہ زنی کے خلاف ہیں، لکھتے ہیں:

''جہاں تک ترقی پسند شاعری کا تعلق ہے، میری رائے میں وہ الگ الگ شاعروں کی انفرادی سوچ کا نتیجہ نہ تھی۔ اس لیے اس سے کسی انفرادی سوچ کا

پیدا ہونا بھی محلِ نظر ہے، یہ شاعری یوں کہنا چاہیے کہ ایک گروہ کے باہمی "صلاح مشورے" کا نتیجہ تھی اور اس گروہ کے سب افراد ایک ہی نوع کے سیاسی محرکات کے پابند تھے۔ ترقی پسندوں کا نظریہ یہ تھا کہ شاعر کو موضوع کے انتخاب میں اپنے انفرادی حق سے دستبردار ہو جانا چاہیے بلکہ ہر موضوع کے بارے میں اپنا ردِ عمل اس عقیدے کے مطابق تیار کرنا چاہیے جو گروہ میں طے پایا تھا۔ میری رائے یہ رہی ہے کہ اگر ادیب و شاعر اپنے ہنر کے ساتھ خیانت کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا تو اسے صرف اپنے ہی اندرونی اور بیرونی تجربات کی روشنی میں اپنا راستہ تلاش کرنا چاہیے اور موضوع کے رد و قبول یا کسی موضوع کے بارے میں اپنے جذباتی یا عقلی ردِ عمل کے لیے کسی خارجی ہدایت کی پیروی نہیں کرنا چاہیے۔"(7)

حلقۂ اربابِ ذوق کے بیشتر شعرا و ادبا بھی ابتداء ترقی پسند گروہ میں شامل یا اس سے متاثر تھے لیکن ترقی پسندوں کی ادعائیت پسندی اور داخلیت و انفرادیت پر قدغن سے بیزار ہو کر ان آزادی پسند ادبا نے اپنا الگ حلقہ تشکیل دیا۔ ترقی پسند اپنے ادب کو "ترقی پسند ادب" کہتے تھے اور حلقے والے اپنے ادب کو "جدید ادب" یا "جدید شاعری" قرار دیتے تھے۔ ترقی پسندوں نے حلقے والوں پر رجعت پسندی و ہیئت پرستی کا الزام لگایا اور اسی طرح حلقے والوں نے ترقی پسند ادب کو محض پروپیگنڈے سے تعبیر کیا۔ یہ نظریاتی کشمکش آزادی سے قبل زوروں پر رہی اور دونوں گروہ اپنے موقف و مقام پر فعال رہے۔ حلقے کے ایک ادیب الطاف گوہر نے حلقے کے شعری تصور کا تعین کرتے ہوئے حسبِ ذیل نکات قائم کیے ہیں:

1۔ اچھی شاعری وہ ہے جو اپنے ماحول سے آشنا ہوتے ہوئے ہمہ گیر تاثیر کی حامل ہو۔

2۔ شاعری اگر شاعری نہیں تو پھر جدید ہو یا قدیم سوختنی ہے۔

3۔ ہمارا احتجاج جمود کے خلاف ہے، روایت کے خلاف نہیں۔

4۔ غزل بطور صنفِ ادب کے ہماری نظروں میں بڑی وقعت رکھتی ہے لیکن اس میں اتنی لچک ہونی چاہیے کہ وہ وقت کے تاثرات کو قبول کرتے ہوئے صحیح رنگوں میں ڈھلتی جائے۔

5۔ پابند نظم، معریٰ نظم اور آزاد نظم مغربی ادب کے اثرات میں پروان چڑھتی ہوئی ہماری قدیم روایات کی مختلف شکلیں ہیں۔

6۔ شاعری کا واحد مقصد اپنے طور پر محسوس کیے گئے تجربے کا مکمل اظہار ہے۔(8)

غرض کہ حلقے والوں کے نزدیک فن میں خلوص و صداقت لازمی عنصر ہے اور احساس و اسلوب ہر لحاظ سے فنکار کو اپنی انفرادیت کا پاس رکھنا لازمی ہے۔ حلقے والوں نے کلاسکی سرمائے سے ترقی پسندوں کی مانند بغاوت و بیزاری کا اظہار نہیں کیا، اسی وجہ سے اردو کے ثقہ شعرا و ادبا ترقی پسندوں سے بدظن و برہم تھے مگر حلقے والوں کے شاکی نہ تھے۔ ن۔م۔ راشد نے حلقے کی نمایاں خدمات کا احاطہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"میری رائے میں حلقے کی خدمات کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے یہ کہ یہی وہ تنہا ادارہ ہے جس نے ادب میں ہر قسم کے تجربے اور جدت کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ دوسرے حلقے نے تنقید میں آزادی اور بیباکی کی روایت کو زندہ اور قائم رکھا ہے۔ تیسرے حلقے نے ادب کو ان غیر ادبی تصورات کے غلبے اور غیر ادبی گروہوں کے استیلا سے محفوظ رکھنے کے لیے حصار کا کام دیا ہے جو ہمارے زمانے میں ادب کے حق میں سب سے بڑا خطرہ ہیں۔ یہ وہ اہلِ قلم ہیں جنھوں نے اپنی بساط کے مطابق زندگی کو اس کی تمام وسعتوں سے دیکھنے کی کوشش کی اور جن کی تحریروں میں زندگی کی وسعت، جامعیت اور تنوع کا شاندار پرتو ملتا ہے۔ اسی لیے یہی وہ ادیب و شاعر ہیں جنھیں صحیح معنوں میں جدید کہا جا سکتا ہے۔"(9)

اوپر کی بحث سے حلقۂ اربابِ ذوق کے ادبی و شعری تصورات پر بڑی حد تک روشنی پڑتی ہے۔ جہاں تک حلقے کی تنقیدی روش و مسلک کا تعلق ہے، اس کی بیشتر تنقیدی کارگزاری حلقے کی ہفتہ وار مجالس میں پڑھی گئی تخلیقات کی فوری و آزادانہ تنقید پر مشتمل ہے، جسے "مجلسی تنقید" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حلقے میں آزادانہ تنقید کی ابتدا میراجی اور یوسف ظفر کی تجویز پر ہوئی(10) ابتداء اس تجویز سے شعرا و ادبا نے اختلاف کیا، لیکن بالآخر متفقہ طور پر مجلسی تنقید کا رجحان پروان چڑھنے لگا۔ حلقے والے ترقی پسندوں کی طرح سے کسی خاص نظریے کے قائل اور مبلغ نہیں تھے بلکہ شعر و ادب کو مقصود بالذات جمالیاتی اور فنی معروض کی حیثیت میں دیکھتے تھے۔ چنانچہ ان کی ہفتہ وار مجالس میں پڑھی گئی تخلیقات پر حلقے کے ادبا آزادانہ انتقادی خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ شروعات میں اس تنقید کا رنگ و رجحان تاثراتی نوعیت کا رہا لیکن رفتہ رفتہ معروضی اور تجزیاتی اسلوب نقد سامنے آنے لگا۔ حلقے میں آزادی سے قبل میراجی، راشد، یوسف ظفر اور الطاف گوہر اور بعض دوسرے ادیبوں نے مجلسی بیانات، خطبات اور حلقے کے پلیٹ فارم سے شائع شدہ مختلف شعری منتخبات میں تحریر کردہ "اداریوں" وغیرہ میں جمالیاتی اور تجزیاتی تنقید کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔

حلقے نے "مجلسی تنقید" میں شعر و ادب کے صرف ہیئتی و فنی پہلوؤں کو ہی مرکزِ توجہ نہیں بنایا تھا بلکہ تخلیقات کے جمالیاتی زاویے کے ساتھ ساتھ اس کی سماجی اور کائناتی افادیت کو بھی ملحوظ رکھا جاتا تھا اور یہ اس لیے تھا کہ حلقے کا آزادانہ تنقید کو فروغ دینا مقصود خاص تھا، ان کے مباحث میں تخلیق کے ترسیل و ابلاغ پر بھی توجہ دی گئی۔ شاعری میں ان کا زور ابہام پر رہا مگر تنقید میں تخلیق کا معروضی تجزیہ مقدم سمجھا گیا۔ یونس جاوید اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

"ان لکھنے والوں کے نزدیک جو حلقۂ اربابِ ذوق سے وابستہ تھے، معاشرہ اور فرد دونوں یکساں اہمیت کے حامل تھے، صرف یہی نہیں بلکہ حلقۂ

ارباب ذوق کے نزدیک ہر لکھنے والے کو یہ حق پہنچتا تھا کہ وہ ذات کے حوالے سے کائنات کا احاطہ جس طرح، جس رخ سے چاہے کرے اور ان اقدار کو اس انداز سے سامنے لائے جس سے عالمگیر انسانیت سے ہمدردی اور روح کی بالیدگی کی صورت پیدا ہو...... اس سلسلے میں حلقۂ ارباب ذوق ترسیل اور اظہار کی اہمیت کا قائل تھا لیکن اس ضمن میں وہ کوئی پابندی عائد کرتا ہوا نظر نہیں آتا...... لکھنے والا جو چاہے جس زاویے سے چاہے دیکھے، سوچے اور لکھے تاہم حلقۂ ارباب ذوق کسی ادبی بے راہروی کو اپنے رکھ رکھاؤ کے باوصف قبول نہ کرتا تھا۔(11)

یہی سبب ہے کہ حلقے والوں کی مجالس میں بعض ترقی پسند ادبا و شعرا بھی شریک ہوتے تھے اور صدارت کے فرائض تک انجام دیتے تھے۔ دراصل جتنی ادعائیت پسندی، ترقی پسندوں (اولین دور میں) تھی اتنی سختی حلقۂ ارباب ذوق نے عائد نہیں کی تھی۔ وہ صرف تخلیق کے جمالیاتی آہنگ و اسلوب کے ہی گرویدہ نہیں تھے بلکہ خیال اور موضوع و مواد کی اہمیت کے بھی قدرداں تھے۔ میراجی نے تو اپنی شاعری اور تنقیدی مباحث میں ''خیال و تصور'' کی اہمیت پر بار بار زور دیا ہے اور اسی خیال افروزی کو وہ صالح ترقی پسندی سے تعبیر کرتے ہیں جو ظالم کے خلاف نہیں بلکہ ظالمانہ نظام کے خلاف انقلاب لانے کا موجب بنتی ہے۔ میراجی نے حلقے کی 1941 کی ''بہترین نظمیں'' کے ابتدائیہ میں مرتبین (میراجی، یوسف ظفر، قیوم نظر) کے انتخاب میں اپنائے گئے تنقیدی معیار و منہاج کے متعلق لکھا ہے:

''ہر رکن نے اپنی اپنی طرف سے بہترین نظم کا تصور پیش کیا اور ان تین پہلوؤں سے مشترک اجزا نکال کر بحث کے بعد ایک خاکہ قائم کر لیا گیا اور ذہنی پس منظر میں شعر کی وضاحت یوں رکھی گئی کہ کوئی خیال یا احساس یا جذبہ جس کی ترجمانی کم سے کم اور مناسب ترین اور بہترین لفظوں میں کی جائے۔ اس کے بعد شعر یا نظم کے دو بڑے پہلو مقرر ہوئے، پہلا خیال یا موضوع کا اور دوسرا فنی خیال یا موضوع کے اعتبار سے اس کی افادیت کا لحاظ بھی رکھا گیا۔ خواہ وہ افادیت انسانی زندگی کے کسی بھی پہلو یا شعبے سے تعلق رکھتی ہو یعنی نظری ہو یا عملی۔ دوسری بات اس خیال یا موضوع کی ادب میں تخیلی (یا فنی لحاظ) سے بنفسہٖ اور ممکن ہو تو اضافی طور پر اہمیت اور درجہ۔ اس کے ساتھ ہی کسی ادبی تحریک کی روشنی میں بنفسہٖ یا اضافی طور پر اس کی اہمیت اور کسی حد تک عصری شعر پر اس کا تاثر۔ (یہ آخری نکتہ ذیلی ہے) دوسرا بڑا پہلو فن کے لحاظ سے تھا، اس میں زبان، محاورہ، بیان، الفاظ کا انتخاب اور نشست، بحر یا وزن کی خیال یا موضوع سے ہم آہنگی، نظم کی ہیئت، تشبیہ، استعارے، کنائے وغیرہ جزئیات، یہ سب باتیں مدنظر رہیں۔''(12)

چنانچہ اسی وسیع النظری کے پیش نظر ''بہترین نظمیں'' اور آزادی کے بعد حلقے کی نظموں کے انتخاب ''نئی تحریریں'' میں کئی ترقی پسندوں کی نظمیں بھی شامل ہوتی رہی تھیں۔ یہ کشادہ نظری ترقی پسند رسائل اور منتخبات میں، دیکھنے کو نہیں ملتی تھی۔ اس اعتبار سے حلقے والے ترقی پسندوں سے زیادہ ''ادب شناس'' تھے۔ سردار جعفری نے فیض کی نظم ''صبح آزادی'' پر جس طرح کی جارحانہ اور غیر دیانتدارانہ تنقید کی ہے، اس طرز نقد سے مجموعی طور پر تخلیقی ادب اور تخلیق کاروں کو نقصان ہی پہنچا ہے۔ حلقے والوں میں تنقید کا بنیادی پیمانہ یہ تھا کہ تخلیق کا اپنی اولین حیثیت و صورت میں ایک جمالیاتی معروض ہونا ضروری ہے۔ خواہ تخلیق کار ترقی پسند ہو، روایتی یا حلقے سے وابستہ ہو۔ اسی انداز نقد کے سبب حلقے والوں نے کلاسکی و قدیم سرمایۂ ادب کی اہمیت سے یکسر انکار نہیں کیا، جب کہ ترقی پسندوں نے غزل اور کلاسکی سرمائے کو زوال پسندی اور جاگیرداری عہد کی یادگار بتا کر غیر مفید قرار دے دیا تھا۔

یوں تو حلقے کی ہفتہ وار مجالس میں شامل ہونے والے مختلف الخیال ادبا حلقے میں پڑھی جانے والی تخلیقات پر آزادانہ طور پر اظہار خیال کرتے تھے اور اس طرح سے ''مجلسی تنقید'' کو فروغ ملتا رہا۔ یہ سلسلہ آزادی کے قبل سے لے کر حلقے کی تقسیم 1972 تک مسلسل جاری رہا۔ لیکن اسی کے ساتھ حلقے نے بعض ایسے جدید نقاد بھی پیدا کیے جو جدید مغربی علوم اور نظریات سے آگاہ تھے اور ان سے اپنے مطالعات میں خاطر خواہ مصرف لینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

حواشی:

1. ''حلقۂ ارباب ذوق'' ص۔22 از یونس جاوید، ناشر مجلس ترقی ادب لاہور، 1984 (طبع اول)
2. ''اردو ادب کی تحریکیں'' ص۔545، از ڈاکٹر انور سدید
3. ''ترقی پسند ادب'' از علی سردار جعفری، ص۔193-94، انجمن ترقی اردو علی گڑھ، (بار دوم)، 1957۔
4. دیباچہ ''اس نظم میں'' از میراجی۔ ناشر ساقی بک ڈپو، دہلی، 1944
5. چارلس بودلیر، میراجی، مشمولہ ''میراجی ایک مطالعہ'' ص۔ 501، مرتب ڈاکٹر جمیل جالبی، دہلی، 1991
6. ابتدائیہ ''1941 کی بہترین نظمیں'' مرتبہ: حلقہ ارباب ذوق، لاہور۔
7. دیباچہ ''لا انسان'' ص۔6-5، بحوالہ: جدید اردو نظم: نظریہ و عمل، ص۔153، عقیل احمد صدیقی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1990۔
8. پنجاب کے نوجوان شاعروں کا نظریہ شعر، ادبی دنیا، اپریل، 1946، لاہور۔
9. بحوالہ ''ن م راشد: شخصیت اور فن'' ص۔19-217، مرتب مغنی تبسم، شہریار۔ ناشر ماڈرن، پبلشنگ ہاؤس، دہلی 1981
10. ''حلقۂ ارباب ذوق'' از یونس جاوید، ص۔34، ناشر مجلس ترقی ادب، لاہور، 1984
11. ''حلقۂ ارباب ذوق'' ص۔36، از یونس جاوید
12. ''1941 کی بہترین نظمیں'' ص۔24، مرتبہ: حلقۂ ارباب ذوق، مکتبہ اردو لاہور، (طبع ثانی)

□□□

پتہ:
Deptt. of Urdu & Persian
University of Rajasthan, Jaipur-302004

فیاض رفعت

موجِ گل، موجِ صبا، سب خاموش

محسن زیدی کی شاعری کی بڑی خوبی جذبۂ صادق کا برجستہ اور برملا اظہار ہے۔ وہ بڑی نرم روی اور شائستگی کے ساتھ واردات قلبی کو لفظوں کا پیکر عطا کرتے ہیں۔ معاملاتِ حسن وعشق کے اظہار میں وہ تامل، تکلف اور احتیاط کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے ہیں۔ ان کے اشعار کی کائنات ہلکے شوخ رنگوں سے سجی ہے۔ وہ اظہار و بیان کی تہذیب وتطہیر کے پیش نظر سوقیانہ پن سے گریز کرتے ہیں اور محبوب کی شوخ وشنگ جلوہ طرازیوں اور کافر ادائیوں کو اپنے فکروفن میں جذب وکشش کے ساتھ تحلیل کر لیتے ہیں۔ وہ شکوہ سنجی کے اظہار میں بھی محتاط رویہ اختیار کیے رہتے ہیں۔ کسی حد تک وہ احتیاط عشق کے شاعر ہیں۔ بقول حسرت:

کٹ گئی احتیاط عشق میں عمر
ہم سے اظہار مدعا نہ ہوا

محسن زیدی لکھنوی مزاج اور ذہن کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اساتذہ سے ان کی ارادت مندی روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ یہ کہنا تو درست نہ ہوگا کہ انھوں نے شاعری کو ساحری کے درجے تک پہنچا دیا تھا مگر یہ بات اپنی جگہ بالکل صحیح ہے کہ وہ شعر کی ظاہری اور باطنی صورت گری میں بڑی مشاقی سے کام لیتے ہیں۔ وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ لفظوں کے دروبست کا اہتمام اور سلیقہ مندی ان کا بنیادی شعار رہا ہے۔ گوکہ ہر بڑے شاعر کی طرح ان کے شعری سفر کا حاصل سراب وتشنہ لبی ہے۔

محسن زیدی سے اُچٹتی ملاقاتیں دلّی کے کافی ہاؤس میں رہی تھیں۔ وہ گفتگو میں کم کم ہی کھلتے تھے۔ یوں بھی تبسم زیر لب کے قائل تھے۔ قہقہہ لگا کر ہنستے ہوئے میں نے انھیں کبھی نہیں دیکھا۔ شعرگوئی کے اعلیٰ ذوق کے باوجود اپنے اشعار لوگوں پر تھوپنے کا انھیں کبھی شوق نہیں رہا۔ ادھر ادھر معیاری رسائل میں ان کا کلام کبھی کبھار دیکھنے میں آجاتا تھا۔ مخمور سعیدی، راج نرائن راز، کمار پاشی اور گوپال متل کے علاوہ محمد یعقوب عامر، انوار رضوی، اندر سروپ دت ناداں اکثر ان کی سلونی غزل کے بانکپن اور تیکھے تیوروں کا محبت سے ذکر کرتے رہتے تھے۔ میں اپنی افسانوی کائنات کے رمز وکنایہ میں ڈوبے رہنے کے باوجود اعلیٰ شاعری کو توقیر اور احترام کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ شکیب جلالی، ابن انشا، منیر نیازی، بانی، حسن نعیم، زیب غوری کی غزلیں اور کمار پاشی، محمد علوی اور ابن انشا، اسد محمد خان کی نظمیں میرے دل کے گھر آنگن میں آنکھ مچولی کھیلتی رہتی تھیں۔

''شہر دل'' سے ''رشتۂ کلام'' تک محسن زیدی میرے لیے اچھے شناسا ہی رہے۔ ''متاع آخر شب'' تک آتے آتے حجاب کے پردے اٹھنا شروع ہوئے اور ان کے اشعار کا سانولا سلونا چہرہ ذہن و دل کی آنکھوں میں روشن ہوتا چلا گیا۔ ''بابِ سخن'' تک رسائی ہوئی تو شعروسخن کی انجمن ناز میں بصیرتوں کی دنیائیں آباد ہوتی چلی گئیں۔ سچ تو یہ ہے کہ بدلتی زندگی کی فلسفیانہ توضیحات جس طور محسن زیدی کے شعری سفر میں شامل ہیں، وہ ذاتی سطح سے اٹھ کر اجتماعی شعور کا حصہ بن گئی ہیں۔ مثال کے طور پر چند شعر پیش خدمت ہیں:

ثبوت اپنا دیا خود تو اعتبار ملا
میں مستند نہ کسی غیر کی سند سے ہوا

اسے منانے کو دل میں غبار کم تو نہ تھا
یہی بہت ہے نہ باہر میں اپنی حد سے ہوا

جتنا کہ جوئے دیدۂ خوناب سے ہوا
اتنا زیاں نہ شہر کو سیلاب سے ہوا

آئی بس اک متاع یقیں دستِ جاں میں کام
کچھ فائدہ نہ مال نہ اسباب سے ہوا

شاعر اپنے استناد کے لیے کسی غیر کی سند کو کارزیاں جانتا ہے۔ اپنے وجود کے اعتبار کے لیے وہ رزم گاہِ زندگی میں اپنا نشان امتیاز خود قائم کرتا ہے۔ محبوب طرحدار کی ستم آرائیوں نے دل عاشق کو غبار سے بھر دیا مگر رسمِ عاشقی کا تقاضہ تھا کہ حسن کی آبرو مجروح نہ ہو۔

جوئے دیدۂ خوناب سیلاب بلاخیز پر حاوی ہے کہ عاشقی کی یہ رسم ستم دیدہ عشق کو بے کنار لامحدود وسعت عطا کرتی ہے۔ محسن زیدی کے اشعار روح کو بالیدگی اور نفس کو تطہیر سے سرفراز کرتے ہیں جسے شیوۂ اہل ہنر کی بصیرت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ گوکہ محسن زیدی کا اردو کی شعری روایت سے رشتہ استوار ہے مگر وہ اپنے دور کی ستم انگیزیوں کو تجربے کی آنچ سے پگھلا کر شعر کے پیکر میں ڈھال لینے کا فن جانتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے۔ شہروں کی محصور زندگی پر کیا خوبصورت طنز کرتے ہیں۔

ہمیں یہ بند کمروں کا مکاں کچھ بھا گیا اتنا
کہ ہم کو اب کوئی آنگن کھلا اچھا نہیں لگتا

اب سائے کے لیے کوئی دیوار ڈھونڈیے
اس شہر میں تو کٹ گئے اشجار سب کے سب

اب آیئے ذرا ان کے شگفتہ لہجے کی رومانیت پر توجہ مرکوز کرتے ہیں کہ غزل کا شاعر حسن کے سامنے سربسجود رہتا ہے کہ یہی عشق کی معراج و منتہا ہے۔

تصویر میں نکھر کے وہ ایسا لگا کہ بس
عکسِ بدن زبان سے خود بول اٹھا کہ بس
یہ کون سیرِ چمن کو نکل پڑا دمِ صبح
چمن میں کھل اٹھے سارے گلاب ایک ہی ساتھ

محسن زیدی نے زندگی کے آشوب اور شوریدگی کا اظہار بھی اپنے شعروں میں بہ خوبی کیا ہے۔ وہ بدلتی ہوئی قدروں کی سفاکی پر نوحہ خواں ہیں:

سارے ہی چہرے، سبھی دیوار و در نا آشنا
لگ رہا ہے مجھ کو سارا ہی نگر نا آشنا
کس سے کیا کہا جائے کس سے کیا سنا جائے
دل تو رنگِ محفل کو دیکھ کر بجھا جائے

حیوانی جذبوں کے فروغ نے صدیوں پرانی تہذیبی ہم آہنگی، یکجہتی اور اتحاد کو اس بری طرح مجروح کیا ہے کہ شاعر کا دل گداختہ نقشِ فریادی کی صورت پکار اٹھتا ہے۔

یوں سمجھ لو کہ بجز نامِ خدا کچھ نہ رہا
جل کے اس آگ میں سب خاک ہوا، کچھ نہ رہا
کس کا سر، کس کی ردا، کس کا مکاں ڈھونڈتے ہو
قتل و غارت میں تو کوئی نہ بچا، کچھ نہ رہا

محسن زیدی نے لکھنوی روایت کے زیر اثر کربلا کے واقعے کو شعری استعارے کے طور پر بہ حسن و خوبی استعمال کیا ہے۔ محسن کی شاعری پر تحسینی نظر ڈالتے ہوئے مخمور سعیدی نے اپنے تجزیاتی مطالعے میں برملا اظہار کیا ہے کہ ان کی غزلوں کا سب سے نمایاں وصف واقعۂ کربلا کا پس منظر ہے۔ ''رشتۂ کلام''، ''متاعِ آخر شب'' اور ''بابِ سخن'' ان کے سبھی شعری مجموعوں میں سانحۂ کربلا کا بے ساختہ و برملا اظہار ہوا ہے۔

تلوار کی وہ جنگ نہ تھی حق کی جنگ تھی
اعلان جس کا منبر و محراب سے ہوا
وہ زیرِ خنجر قاتل نہ تھا گلو کوئی
وہ اک خیال تھا جس کو شہید کرتے رہے
کنارے آب کسی کی جو پیاس یاد آئی
تو پھر رہا نہ ہمیں اپنی تشنگی کا خیال

محسن زیدی کی شاعری کی لفظیات پر نظر ڈالی جائے تو بے اختیار داد دینے کو ہی جی چاہے گا۔ گیان چند جین نے ان کے اشعار میں لفظوں کے در و بست اور ان کی نغمگی، شگفتگی اور ربودگی کی ستائش کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''محسن کے یہاں ایسی کئی بلیغ ترکیبیں ملتی ہیں جو نگاہ سے ہوتی ہوئی دل میں اتر جاتی ہیں۔ جیسے رہگزرِ خواب پہ خوشبو کا سفر، لفظوں کی چادر، شجر لہو کے، خواب کے پیکر، سفر نا آشنا، آواز کا جنگل، خوابوں کے جزیرے، سنگِ صدا وغیرہ۔''

محسن زیدی کی غزلیہ شاعری کا ایک نشان امتیاز یہ بھی ہے کہ ناقدری دنیا کا شکوہ کرتے وقت بھی وہ حرمت شاعر کا پورا خیال رکھتے ہیں۔

اک نقدِ ہنر ہے کہ نہیں جس کی کوئی قدر
پاس اس کے سوا اور اثاثہ نہیں کوئی
خوشا نصیب ملا ہے وہ اعتبارِ نظر
کہ خوف ہے کسی ناقد نہ نکتہ چیں کا مجھے
مرا کلام تو کیا ناقدینِ فنِ محسن
کلامِ حق میں بھی قطع و برید کرتے رہے

ابھی ''جنبشِ نوکِ قلم'' کی کرشمہ سازی جاری تھی، رنگ و رامش کی سحر انگیز کائنات کا فسوں عروج پر تھا کہ خود بین و خود آرا شاعر کے ہاتھ سے قلم چھوٹ گیا۔ کہ دل کی دھڑکنیں خاموش ہو گئی تھیں۔ موجِ گل موجِ صبا سب پر سکوت طاری تھا۔

سوائے خاکِ جاں باقی بچا کیا
کسی کی اب دعا کیا بد دعا کیا

تین جولائی دو ہزار تین کی صبح فسانہ گو شاعر خود کہانی بن گیا۔

سنتے سنتے وہ نیند آجانا
وہ کہانی کا مختصر ہونا

مگر اس کے لوح و قلم کی حرمت ہمیشہ باقی رہے گی۔ شاعر کی خودشناسی و خود آگہی کا رمزیاتی استعارہ اس کی شعری کائنات یوں بنتا ہے۔

نام مرا چہار سو ذکر مرا زباں زباں
خاک نوائے غم مری اڑ کے گئی کہاں کہاں

□□□

پتہ:

328, Eldbco Green
Dream Villa,
Gomti Nagar,
Lucknow-22601

ملک زادہ جاوید

لکھنؤ کی تین شخصیتیں

عہد حاضر کے جدید لب و لہجہ کے شاعر عرفان صدیقی کا وطن حالانکہ بدایوں تھا مگر لکھنؤ ان کا وطنِ ثانی تھا۔ وہ پریس انفارمیشن بیورو (PIB) میں ملازم تھے اور مختلف شہروں سے ہو کر لکھنؤ میں بہ سلسلۂ ملازمت مقیم تھے۔ ان کے گھر اور میرے گھر کے تمام افراد کا ایک دوسرے کے یہاں آنا جانا تھا۔ وہ سنی فرقے سے تعلق رکھتے تھے مگر شیعہ فرقے کے لوگ ان کو قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے جس کی وجہ ان کی شاعری تھی کیونکہ عرفان صدیقی کی شاعری میں کربلا کا جو پس منظر تھا اور جو تشبیہات اور استعارات انھوں نے وہاں سے اخذ کیے تھے، اس نے لکھنؤ کی شیعہ برادری کو بڑا متاثر کیا تھا۔ سنی بھی ان کے گرویدہ تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ عرفان صدیقی شرافت اور انکساری کا مجموعہ تھے۔ ان کے علم، سنجیدگی اور ذہانت کا احساس ان سے پہلی ہی ملاقات میں ہو جایا کرتا تھا۔ نیر مسعود اور شمس الرحمٰن فاروقی سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ اس زمانے میں فاروقی صاحب لکھنؤ میں Post and Telegraph محکمے میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ اکثر ان تینوں حضرات کی محفلیں سجا کرتی تھیں۔ مجھے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے، مشہور فکشن رائٹر اقبال مجید نے جو اس زمانے میں لکھنؤ میں رہا کرتے تھے ایک ادبی نشست اپنے گھر پر رکھی جس کی صدارت شمس الرحمٰن فاروقی نے کی۔ اس نشست میں غالباً دو افسانہ نگاروں کے افسانوں اور عرفان صدیقی کی شاعری پر گفتگو ہونی تھی۔ اس نشست میں بحیثیت سامع کے میں بھی موجود تھا۔ نشست میں جو دو افسانے پڑھے گئے ان پر بڑی زوردار گفتگو ہوئی۔ پھر عرفان صدیقی نے اپنا کلام سنایا۔ اس سے پہلے کہ عرفان صاحب کے کلام پر بحث کا آغاز ہوتا صدرِ محترم نے کہا کہ ''عرفان صدیقی کی شاعری ہر لحاظ سے مستند اور معیاری ہے وہ ہمارے عہد کے ایک بڑے شاعر ہیں۔ چنانچہ ان کی شاعری پر گفتگو کی گنجائش نہیں۔ چنانچہ بحیثیت صدر میں اس نشست کے اختتام کا اعلان کرتا ہوں.....''

عرفان صدیقی چھوٹے سے قد کے بلند قامت انسان اور شاعر تھے۔ ان کے مکان سے متصل والی آسی صاحب کا مکان تھا۔ سامنے کی طرف معروف افسانہ نگار عائشہ صدیقی صاحبہ رہا کرتی تھیں۔ ان تینوں سے میرے مراسم بہت اچھے تھے۔ عرفان صدیقی کا مکان سب سے پہلے پڑتا تھا جس میں ڈرائنگ روم نیچے کے حصے میں تھا، مکان کا باقی حصہ پہلی منزل پر واقع تھا جہاں عرفان صدیقی کی فیملی رہا کرتی تھی۔ ان کے یہاں پردے کا رواج تھا مگر جن لوگوں سے ان کے گھریلو تعلقات تھے ان کے سامنے ان کی اہلیہ آجاتی تھیں۔ میں اس زمانے میں ان کے گھر کے ایک فرد کی طرح سے تھا اس لیے جب میں ان کے دولت کدے پر جاتا تھا اور نیچے ڈرائنگ روم میں عرفان صاحب کے پاس بیٹھا ہوتا تھا تو اکثر ان کی اہلیہ یا تو میری آواز سن کر نیچے آجاتیں یا مجھے اوپر بلا کر بڑی محبت اور شفقت کے ساتھ خیر و عافیت دریافت کرتیں۔ کبھی کبھار وہ ہماری گفتگو میں بھی حصہ لیا کرتی تھیں۔

کچھ مدت بعد میرا ٹرانسفر نوئیڈا ہو گیا اور میں مع اہل و عیال نوئیڈا منتقل ہو گیا۔ لکھنؤ میرا آنا جانا کم کم ہی ہوتا مگر جب بھی جاتا عرفان صدیقی سے ملنے ان کے دفتر پہنچ جایا کرتا تھا جو میرے ہیڈ آفس جواہر بھون کے سامنے واقع تھا۔ لکھنؤ اور دلی کے ادبی ماحول پر بات ہوتی تھیں میں اپنے شعر سناتا اور ان کی چائے پی کر رخصت لیتا۔ عرفان بھائی شعر سنانے کے معاملے میں بخیل تھے، بار بار اصرار کرنے پر بڑی مشکل سے شعر سناتے تھے۔ عام طور پر یہ کہہ کر دامن بچا لیتے تھے کہ انھیں اشعار یاد نہیں ہیں اور وہ اپنی ڈائری گھر پر چھوڑ آئے ہیں لیکن دیگر شعرا کے اشعار وہ اصرار کر کے سنتے تھے اور داد و تحسین سے نوازتے تھے۔ PIB سے ریٹائر ہونے کے بعد وہ ایک اخبار ''صحافت'' سے منسلک ہو گئے جہاں ایک عرصے تک وہ رہے ''صحافت'' کے دفتر روز شام کو ان کے چند احباب جن میں میرے والد پروفیسر ملک زادہ منظور احمد بھی شامل تھے، پہنچ جاتے۔ محفلیں جمتیں۔ پھر خرابیٔ صحت کی وجہ سے انھوں نے ''صحافت'' کو بھی خیر باد کہہ دیا۔ ایک دن میرے والد کا فون آیا کہ عرفان بھائی کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو گئے ہیں اور لکھنؤ کے میڈیکل کالج کے ڈراما سینٹر میں زندگی اور موت کی لڑائی لڑ رہے ہیں۔ میں نوئیڈا سے لکھنؤ پہنچا اور ہم باپ بیٹے عرفان صدیقی کو دیکھنے ڈراما سینٹر پہنچ گئے جہاں وہ بے ہوشی کے عالم میں ملے۔ بھابھی محترمہ ان کے سرہانے موجود تھیں اور انھیں ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ کبھی کبھی وہ ایک صاف کپڑے سے ان کا چہرہ صاف کر دیا کرتی تھیں۔ کچھ دیر ٹھہر کر ہم لوگ بھابھی کو جھوٹی تسلیاں دے کر بوجھل قدموں سے وہاں

سے چلے آئے۔ دوسرے دن پتا چلا کہ عرفان صدیقی اپنی بھرپور موجودگی کا احساس کروا کر دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے۔

(2)

''مکتبہ دین و ادب'' والی آسی صاحب کی چھوٹی سی دکان کا نام تھا جو امین آباد لکھنؤ میں واقع تھی۔ اس دکان میں دین و ادب دونوں موضوعات کی کتابیں مل جاتی تھیں۔ شعرا اور ادبا کے علاوہ سماج کے ہر طبقے کے لوگوں کی آمد و رفت اس دکان پر رہا کرتی تھی۔ جن میں صوفی، غزل گا یک، ڈاکٹر، وحشی، نیم وحشی، بت پرست، بت شکن گویا کہ ہر قماش کے لوگ شامل تھے۔ ان کا مطالعہ وسیع اور اردو ادب کے کلاسیک پر ان کی بھرپور نظر تھی۔ پرانے اساتذہ کا کلام انھیں حفظ تھا۔ ہر آنے والا ان سے ادب اور شاعری کے معاملات میں استفادہ کرتا تھا۔ مبتدی شعرا اور ان کے شاگرد ان کی دکان کا طواف کرتے ہوئے دکھائی پڑتے تھے۔ قہقہے، چائے، پان، سگریٹ، بیڑی، شاعری، غیبتیں، ترغیبتیں، اصلاحیں، یہ سب چیزیں وہاں کے روزمرّہ میں شامل تھیں۔ جو لوگ ان کے حلقہ بگوشوں میں شامل تھے اور ان سے مستقل رسم و راہ رکھتے تھے ان میں احقر بھی شامل تھا۔ یہ بات بالکل سچ ہے کہ والی آسی کی دکان پر گئے بنا ایک خالی پن کا احساس شعرا اور ادبا کو ہوتا تھا۔ بیرونی شاعر و ادیب بھی لکھنؤ آنے پر ان کی مزاج پرسی کے لیے اور ان کی دلچسپ گفتگو سننے کے لیے ان کی دکان کی جانب رواں دواں نظر آتے تھے۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ والی آسی سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ انھوں نے میری تربیت اس طرح کی کہ وہ کسی استاد کا کوئی مصرعہ دے کر مجھ سے اس پر مصرعہ لگانے کے لیے کہتے۔ اگر میں نے مصرعہ ٹھیک ٹھاک لگا دیا تو وہ بہت خوش ہوتے۔ مطمئن نہ ہونے کی صورت میں تب تک اپنی دکان سے مجھے رخصت نہیں کرتے تھے جب تک میں ان کے مزاج کے مطابق کوئی مصرعہ نہ لگا دیتا تھا۔ مجھے مشاعروں کی لت بھی انھی نے لگائی اور کئی مشاعروں میں مجھے اپنے ہمراہ لے گئے اور مجھ میں ایک اعتماد پیدا کیا۔ وہ ایک مذہبی انسان تھے، نماز روزے کے پابند۔ اپنی چھوٹی سی دکان میں مصلیٰ اور تسبیح رکھتے تھے۔ نماز کے وقت وہ سب لوگوں کی موجودگی ہی میں نماز پڑھنے لگے۔ رمضان کے دنوں میں افطار کے وقت ان کی دکان میں ایک جشن کا ماحول رہتا تھا۔ لوگ افطاری بنوا بنوا کر لاتے تھے اور ایک ساتھ بیٹھ کر روزہ کھولتے تھے۔ ان لوگوں میں میرے جیسے کچھ بے راہ رو لوگ بھی تھے جو بغیر روزہ رکھے ان کے یہاں افطاری کرنے پہنچ جاتے تھے۔ میرے نوئیڈا منتقل ہو جانے کے بعد بھی ان کی دکان سے میرا رشتہ نہیں ٹوٹا۔ میں جب بھی لکھنؤ جاتا، ان کی دکان پر ضرور پہنچتا۔ والی صاحب ایک حساس طبیعت رکھنے والے معصوم صفت انسان تھے۔ ایک بار شاہ جہاں پور کے مشاعرے کے کنوینر انھیں مدعو کرنے آئے تو میں ان کے مکتبے میں موجود تھا۔ چنانچہ انھوں نے مجھے بھی ایک معقول زاد راہ کے ساتھ اس مشاعرے میں مدعو کروا دیا۔ وقت مقررہ پر ہم لوگ ٹرین پر سوار ہو گئے۔ برابر والے ڈبے میں اس زمانے کی معروف شاعرہ برکھا رانی بھی تھیں، جو اسی مشاعرے میں جا رہی تھیں۔ ٹرین جب شاہ جہاں پور پہنچی تو نوجوانوں کا ایک غول نمودار ہوا اور وہ ہم لوگوں سے یہ کہہ کر برکھا رانی کو اپنے ساتھ لے گیا کہ آپ لوگ اسٹیشن پر رکیں، آپ حضرات کو لینے کے لیے کوئی آتا ہوگا۔ والی آسی صاحب کو لڑکوں کا یہ برتاؤ بہت برا لگا اور پھر جب کافی انتظار کے بعد بھی کوئی نہیں آیا تو والی بھائی برہم ہو گئے اور لکھنؤ واپسی کا ٹکٹ لے کر ٹرین کا انتظار کرنے لگے۔ اسی درمیان مشاعرہ کمیٹی کے لوگ آ گئے مگر والی آسی صاحب کسی طور پر بھی مشاعرے میں چلنے کے لیے رضامند نہیں ہوئے اور مجھے لے کر لکھنؤ واپس ہو گئے۔

میں ان کی دکان پر بیٹھا تھا، والی بھائی سراج اورنگ آبادی کا کلام دیوان سے مجھے سنا رہے تھے، بیچ بیچ میں مفہوم بھی سمجھاتے جا رہے تھے۔ اچانک ایک بھکارن دکان پر آئی اور اس نے والی بھائی سے دس روپے مانگے۔ والی صاحب بولے کہ مائی دس روپیوں کا کیا کروگی؟ اس نے کہا چائے پینا ہے۔ والی صاحب بولے چائے تو دو روپے میں آتی ہے اور میز کے نیچے سے ڈبہ نکال کر اسے دو روپے دینے لگے۔ یکا یک اس عورت نے جھپٹا مارا اور پورا ڈبہ جس میں تقریباً سو روپے رہے ہوں گے والی آسی کے ہاتھوں سے چھین کر بھاگ گئی۔ میں نے اس عورت کو تھوڑی دور دوڑایا مگر وہ میرے ہاتھ نہیں آئی۔ میں جب لوٹا تو والی آسی مسکرا کر بولے کہ تمھیں اس عورت کے پیچھے نہیں جانا چاہیے تھا۔ مجھے بہت غصہ تھا، میں بولا کہ آپ نے فقیروں کو منہ چڑھا رکھا ہے جس کی وجہ سے اس کی یہ ہمت ہوئی کہ آج اس نے یہ حرکت کی۔ والی بھائی بڑے اطمینان سے بولے کہ آج اللہ تعالیٰ نے اس کی تمام ضروریات کی تکمیل میرے ذمے کر دی تھی۔ خدا کرے وہ پیسے جو وہ مجھ سے چھین کر لے گئی ہے وہ اس کے کام آ جائیں۔

نوئیڈا سے لکھنؤ پہنچا تو آفس سے سیدھا والی بھائی کی دکان پر گیا۔ وہ صاف ستھرے کپڑے پہنے بیٹھے تھے۔ میں نے پوچھا کہیں جا رہے ہیں؟ بولے کہ آج کرشن بہاری نور کی ایک شاگردہ، جو ڈاکٹر ہیں، انھوں نے PGI میں ایک نشست رکھی ہے، وہیں جانے کا ارادہ ہے تم بھی چلو۔ میں نے ان سے معذرت طلب کی اور کہا کہ میری ملاقات ابھی والدین سے نہیں ہوئی ہے۔ میں اسٹیشن سے سیدھا آفس چلا گیا تھا، اب مجھے آپ سے مل کر گھر جانا ہے۔ دکان

سے باہر کار کا ہارن بجا اور کرشن بہاری نور گاڑی سے اترے۔ نور صاحب سے میری سلام دعا ہوئی اور وہ والی آسی کو لے کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ چلتے چلتے والی آسی نے مجھ سے کہا کہ کل ضرور آنا میں تمھارا انتظار کروں گا مگر پھر وہ کل کبھی نہیں آیا۔ نشست کے دوران انھیں دل کا دورہ پڑا اور وہیں ان کا انتقال ہوگیا۔ دوسرے دن ان کی میت میں ہزاروں کا مجمع تھا۔ میں بھی اس مجمع کے ساتھ ساتھ عیش باغ قبرستان تک گیا اور والی آسی کو دفن کر کے لوٹ آیا۔ آج جب بھی امین آباد میں والی آسی کی دکان کے سامنے سے میرا گزر ہوتا ہے اور اس دکان سے نگاہیں بچا کر میں تیز تیز قدموں سے نکلتا ہوں تو والی آسی کی آواز پیچھا کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے جو مجھ سے کہتی ہے ''کدھر جا رہے ہو ملک زادہ جاوید! سراج اورنگ آبادی، اختر الایمان اور میرے شاگرد منور رانا کا کلام نہیں سنو گے۔''

(3)

میرے والد پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے اتر پردیش میں اردو کے حقوق کی بازیابی کے لیے ''اردو رابطہ کمیٹی'' کے نام سے ایک تنظیم بنائی جس میں مشہور افسانہ نگار رام لعل ان کے ساتھ ساتھ تھے۔ ان حضرات نے اتر پردیش کے مختلف شہروں، قصبوں اور گاؤوں میں جا جا کر تقریریں کیں اور اردو کے حق میں ایک عوامی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ایک دن اردو رابطہ کمیٹی کے زیر اہتمام ودھان سبھا لکھنؤ کے سامنے اردو والوں نے گرفتاریاں دیں۔ اس کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے اور برسر اقتدار جماعت کانگریس کے وزیر اعلیٰ نرائن دت تیواری نے یوپی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کا اعلان کر دیا۔ اس پوری تحریک کو مالی امداد فراہم کرنے والے مقبول احمد لاری تھے جو اردو زبان کے عاشقوں میں تھے۔ ''میر اکیڈمی'' نام کی ایک تنظیم بھی انھوں نے قائم کی تھی جس کے تحت شاعروں اور ادیبوں کو ''امتیاز میر'' اور ''نوائے میر'' نام کی توصیفی اسناد کے ساتھ رقمی انعام بھی دیا کرتے تھے۔ اس زمانے کا شاید ہی کوئی قابل ذکر اردو کا ادیب و شاعر ہو جس کو یہ اعزاز و انعام نہ دیا گیا ہو۔ عام دنوں میں بھی ان کی کوٹھی ''مقبول منزل'' میں اردو والوں کی چہل پہل رہتی تھی اور شہر کے ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ دیگر شہروں سے بھی ان کے یہاں ادیب و شاعر آیا جایا کرتے تھے۔ مقبول احمد لاری قصبہ لار کے رہنے والے تھے جو دیوریا ضلع میں ہے۔ ان کا کاروبار نیپال میں تھا۔ ان کی کوٹھی سٹی اسٹیشن لکھنؤ کے جوار میں تھی جو خوبصورتی کے لحاظ سے لکھنؤ کی گنی چنی عمارتوں میں سے ایک اور بہت وسیع اور عریض تھی۔ اس کوٹھی کے صدر دروازے کے قریب صاف ستھری کرسیاں پڑی رہتی تھیں۔ لاری صبح کو انھی کرسیوں میں سے ایک پر آ کر بیٹھ جاتے تھے اور اپنے مقررہ وقت تک یہیں لوگوں سے ملا کرتے تھے۔ پھر کوٹھی کے اندر چلے جاتے تھے۔ شام کو پھر باہر آ جاتے اور آنے والے دوستوں ادیبوں اور شاعروں سے گپ شپ کیا کرتے تھے۔ چائے اور ناشتے کا بندوبست ملنے والوں کے لیے رہتا تھا۔ لاری صاحب کی ایک شیروانی تھی جس کے بٹن سونے کے تھے، وہ شیروانی وہ خاص خاص موقع پر پہنا کرتے تھے۔ ایک دن وہ کچھ اداس اور افسردہ نظر آئے تو میرے والد نے جن کی مستقلاً ان کے پاس آمد ورفت رہتی تھی، ان سے پوچھا کہ ماجرا کیا ہے۔ وہ بولے کہ کسی ملازم نے ان کی شیروانی کا ایک بٹن توڑ لیا ہے جس کی وجہ سے وہ پریشان ہیں۔ میرے والد نے کہا کہ آپ تو ماشاء اللہ بڑی حیثیت کے مالک ہیں دوسرا بٹن بنوا لیجیے۔ وہ بولے بنوا تو لیتا مگر جس کاریگر نے یہ بٹن بنائے تھے اور ان پر نقاشی کی تھی وہ کاریگر مر چکا ہے۔

بادشاہوں، رئیسوں، جاگیرداروں نے اپنے اپنے وقت میں شعرا اور ادبا کی ہمیشہ قدر کی ہے۔ ان کی ان قدر افزائیوں کے قصے ادبی تذکروں اور تاریخوں میں محفوظ ہیں۔ تخلیق ہو یا تخلیق کار بغیر سرپرستی کے نمایاں نہیں ہوتا ہے۔ مقبول احمد لاری نے اردو زبان اور ادب کے لیے جو خدمات انجام دی ہیں وہ بھی یاد رکھی جائیں گی۔ ''حدیث میر'' کے نام سے انھوں نے میر کا جو دیوان شائع کیا ہے، اتنی خوبصورت کتاب میں نے آج تک نہیں دیکھی ہے۔ مجھے بھی ان کی خدمت میں نیاز حاصل تھا۔ میرے والد ملک زادہ منظور احمد ان کے قریبی لوگوں میں تھے، وہ لاری صاحب سے ملنے جاتے تو کبھی کبھی مجھے بھی ساتھ لے لیتے۔ لاری صاحب میری خیریت دریافت کرتے اور اچھا انسان بننے کے لیے کیا کیا ضروری ہے، اس کا درس دیتے۔ اردو زبان کے مخالفین کی تنگدلانہ حرکتوں سے انھیں تکلیف پہنچتی تھی۔ ایسے لوگوں سے وہ کہتے تھے کہ اردو زبان ہندوستانی قوم ایک مشترکہ ورثہ ہے جس میں تمام مذاہب کے لوگ شامل ہیں۔ اردو کسی ایک فرقے یا ایک مذہب کی نہیں ہے، اس کو بھی ہندوستان میں اسی طرح پھلنے پھولنے کا حق ہے جس طرح یہاں کی دوسری زبانوں کو۔

مقبول احمد لاری صاحب اب ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ مقبول منزل اگرچہ اپنی جگہ پر ہے، اجلے غلافوں میں ملبوس کرسیوں پر گرد نے اپنے پاؤں پھیلا لیے ہیں، کوٹھی کا باہری حصہ شادی گھر میں تبدیل ہو چکا ہے۔ وہ محفلیں رہیں اور نہ وہ قہقہے تاہم لاری صاحب کی یادیں ہیں جو اب بھی مقبول منزل کے گوشے گوشے کو آباد کیے ہوئے ہیں۔

□□□

پتہ:
30-D, Neelgiri 1, Sector-34,
Noida - 201301 (U.P.)

ارشاد عالم

کمیونٹی ریڈیو

''اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ یک طرفہ معاشی ترقی مکمل ترقی نہیں ہے۔ ترقی کو دوطرفہ ہونا چاہیے جس میں معاشرہ یا سماج فقط ترقی کا محصل نہ ہو بلکہ خود بھی ترقی کے عمل میں محرک کا کردار ادا کرے۔ اس کام کے لیے کمیونٹی ریڈیو مناسب ترین آلہ ہے۔ اپنی مدد آپ کرنے کے لیے یہ ایک قوی اور سہل الحصول وسیلہ ہے جس سے تعلیمی ترقی اور ساتھ ہی ساتھ تفریح کے مقصد کو بھی بہ آسانی حاصل کیا جا سکتا ہے۔''[1]

کمیونٹی ریڈیو نہ صرف سماج کی ترقی کا آئینہ دار ہوتا ہے بلکہ یہ علاقائی تہذیب اور شناخت کو پروان چڑھانے میں بھی معاونت کرتا ہے۔ کمیونٹی ریڈیو کسی بھی علاقے کے لوگوں کے بنائے گئے پروگراموں کو نشر کرتا ہے جس سے اس علاقے کے لوگوں کی فکر، ان کا رویہ اور کام کاج کرنے کا رجحان ظاہر ہوتا ہے۔ اس طرح کمیونٹی ریڈیو کا قیام ہمیں مختلف علاقوں کی خصوصیات سے واقف کراتا ہے۔

ہندوستان میں جہاں مختلف رنگ ونسل کے لوگ رہتے ہیں اور ملک کے طول وعرض میں تقریباً دو سو (200) زبانیں اور سولہ سو (1600) بولیاں بولی جاتی ہیں[2] جہاں ہر دس میل پر لوگوں کا لہجہ اور لباس بدلتا ہوا ملتا ہے، جہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر متضاد اور مختلف قدریں ایک ساتھ چلتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں، کمیونٹی ریڈیو از بس ضروری ہے۔ کمیونٹی ریڈیو کے ذریعے ان مختلف اور متضاد قدروں کو زبان ملے گی، بحث ومباحثے کا راستہ ہموار ہوگا، اقدار کی پرکھ کا موقع ملے گا، دو بہتر قدروں میں سے زیادہ بہتر قدر کا تعین آسان ہوگا اور اس طرح پورے ملک کے لیے یکساں سِول کوڈ بنانے کا ہمارا دستوری خواب شرمندۂ تعبیر ہو پائے گا۔

ہمارا ملک زرعی بنیادوں پر استوار ہے۔ نصف سے زائد آبادی آج بھی گاؤں میں رہتی ہے لہٰذا ان کے درمیان ترسیلی بعد (Communication Gap) پایا جاتا ہے۔ اسے کمیونٹی ریڈیو کے ذریعے ختم کیا جا سکتا ہے۔ ہماری قوم میں اضافی فطانت (Extra Talent) بھی بہت ہے جسے سامنے آنے کا موقع نہیں مل پاتا ہے۔ کیونکہ ترسیل و ابلاغ کے سارے ذرائع صرف بڑے شہروں میں پائے جاتے ہیں، جہاں تک ہر کس و ناکس کی رسائی ممکن نہیں۔ ثانیاً یہ کہ شہروں میں ترسیل و ابلاغ کے جو مراکز ہیں وہاں فنکاروں کی ایسی ہوڑ لگی ہوتی ہے کہ صرف پیشہ ور (Professional) فنکار ہی کامیابی حاصل کر پاتے ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ترسیل و ابلاغ کے ان مراکز کی بنیاد صنعتی نقطۂ نظر پر مبنی ہے۔ جوہر قابل کی تراش خراش ان کا شیوہ نہیں انھیں تو شوکیس میں سجانے والا مال چاہیے۔ کمیونٹی ریڈیو کے ذریعے دیہی نوجوانوں کو اپنی فطانت ثابت کرنے کا موقع ملے گا اور ان کے اندر جو تخلیقیت (Creativity) ہے وہ نکھر کر سامنے آئے گی۔

حکومت نے دیر سے سہی مگر اس طرف توجہ کی ہے۔ تعلیمی اداروں کے ساتھ مل کر Community Radio چلانے کا باقاعدہ پروگرام بنایا گیا اور اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی کو یہ ذمے داری دی گئی کہ مختلف اداروں کے ساتھ مل کر چالیس (40) ریڈیو اسٹیشن کا اولین نشانہ مقرر کیا جائے۔ اس کے نتیجے میں جامعہ ملیہ اسلامیہ I.I.M.C، راجستھان یونیورسٹی اور انا یونیورسٹی، میں کمیونٹی ریڈیو پروگرام شروع ہو چکے ہیں۔ دیگر اداروں میں بھی جلد ہی پروگرامنگ شروع ہو جائے گی۔

کمیونٹی ریڈیو کی خصوصیات: ہر چند کہ اپنے کام کے طریقے اور مقصد کے لحاظ سے کمیونٹی ریڈیو عوامی ریڈیو جیسا ہی ہے لیکن کمیونٹی ریڈیو پیشہ ورانہ (Professional) نقطۂ نظر سے نہیں چلایا جاتا۔ اس میں عوام خود ہی پروگرام بناتے، خود ہی تیار کرتے اور خود ہی پیش کرتے ہیں۔ مقصد خود اپنی اور اپنے سماج کی ترقی ہوتا ہے۔ اس پر جو تفریح پیش کی جاتی ہے وہ ایک اجتماعی سماجی تاثر لیے ہوتی ہے، تربیت یافتہ فنکاری نہیں۔

کمیونٹی ریڈیو کے فرائض میں علاقائی تشخص اور تہذیب کی نمائندگی، مختلف ذاتوں، فرقوں اور پیشوں کے لوگوں کی نمائندگی، جمہوریت کے استحکام کی کوشش، سماجی ترقی اور اچھی حکومت کے لیے کوششیں اور نشر و اشاعت کے بازار کے لیے نئے لوگوں کو تیار کرنا شامل ہیں۔ اس طرح کمیونٹی ریڈیو پر تعلیم کسی تربیت یافتہ استاد سے لکچر سننے کی بہ نسبت ایک دوسرے کے تجربے سے فائدہ اٹھانے جیسی ہوتی ہے۔

عوام تک رسائی اور ان کی حصہ داری: ہر شہری لائق اعتبار، صحیح، اور بروقت خبر حاصل کرنے کا حق رکھتا ہے[3] اس حق کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایسی نشریات کے اصول کچھ اس طرح ہوں کہ عوام کی رسائی اور ان کی حصہ داری دونوں ہی ممکن العمل ہوں۔ اس کے لیے UNESCO نے کچھ اصول وضع کیے، یہ حتمی اصول نہیں ہیں، جگہ اور وقت کے لحاظ سے انھیں بدلا جا سکتا ہے۔ اصول یہ ہیں:

☆ کمیونٹی ریڈیو نشریات کا متعینہ سامعین تک پہنچنا۔

☆ علاقے کے لوگ ریڈیو کے پروگرام کی پالیسیوں، منصوبوں، خدمات اور مقاصد طے کرنے میں شامل ہوں۔

☆ پروگرام کے موضوع، مواد اور وقفہ (Duration) کے متعلق فیصلہ کرنے میں سماج حصہ دار ہو۔

☆ عوام پروگرام کا انتخاب خود کریں، بجائے اس کے کہ کوئی منیجر یا فنکار اپنی مرضی چلائے۔[4]

کمیونٹی ریڈیو تک سماج کے ہر طبقے کی رسائی ہونی چاہیے اور اسی کے لحاظ سے پروگراموں میں بھی نیرنگی پیدا کی جانی چاہیے۔ سماجی رسم و رواج بھی ایک فنکارانہ عمل ہیں مثلاً قصہ گوئی، شادی بیاہ کے گیت، چھوٹے موٹے تہواروں کی مناسبت سے کھیل کود اور گانا بجانا وغیرہ فنی خوبی رکھتے ہیں۔ علاقائی ریڈیو پر ان چیزوں کو خاص طور سے پیش کرنا چاہیے۔

روز بہ روز سکڑتی ہوئی دنیا میں عالم کاری کی وجہ سے سب سے زیادہ نقصان انفرادیت، تشخص، سماجی اقدار اور خاص کر بولیوں کا ہو رہا ہے۔ دُنیا میں جہاں قریباً چھ ہزار سات سو زبانیں بولی جاتی ہیں، کوئی بھی حکومت یا ادارہ اپنی ریاست کی تمام بولیوں/ زبانوں کو فروغ نہیں دے سکتا۔ لہٰذا اپنے تشخص، سماجی اقدار، اپنی بولیوں اور رسم و رواج کا تحفظ خود عوام کی ذمے داری ہے۔ اس کام کے لیے کمیونٹی ریڈیو سے زیادہ معاون کوئی اور ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ ذریعہ کم سے کم خرچ، کم سے کم جگہ اور کم سے کم انتظامیہ کے ذریعے سب سے زیادہ آسانی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

''ایک کمیونٹی ریڈیو کے لیے 10 واٹ کے ٹرانسمیٹر جو ایک معمولی بیٹری (Battery) سے چلایا جا سکتا ہے اور ایک Sound mixer کی ضرورت ہوتی ہے جس کے ذریعے آواز، میوزک اور سمعی تاثرات (Sound, music and sound effects) کو ایک پروگرام میں ملایا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ایک عام ٹیپ ریکارڈ (Gramophone) کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ سب چیزیں بہت ہی کم قیمت میں بازار میں دستیاب ہیں۔''[5]

کمیونٹی ریڈیو کے لیے رقم کا حصول بڑا مسئلہ نہیں بلکہ یہ مسئلہ سیاسی ہے کیونکہ عام طور پر کوئی بھی حکومت عوام کی آواز کو سنسر (Censor) کیے بغیر نشر کیے جانے کی اجازت دینا نہیں چاہے گی۔ خاص طور پر ہندوستان جیسے ملک میں جہاں بہت ساری تہذیبیں ایک دوسرے سے متصادم ہیں اور کوئی بھی تہذیب کسی خاص جغرافیائی خطے میں محدود نہیں ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک مشترکہ تہذیب بھی اپنا وجود رکھتی ہے۔ صدیوں سے ساتھ رہتے ہوئے لوگوں نے ایک دوسرے کے معاملات سے سمجھوتہ کرنا سیکھ لیا ہے۔ ہندستان کثرت میں وحدت (Unity in diversity) کی ایک اعلیٰ مثال بھی ہے۔

اس ضمن میں یہ ایک عام نقطۂ نظر ہے کہ حکومتیں اظہار کے ان تمام ذرائع کو دبانا چاہتی ہیں جو کسی بھی طرح ان کی پالیسیوں کے خلاف جا سکتی ہیں یا ریاست کے انتظام میں کسی طرح کا خلل ڈال سکتی ہیں۔ اب تک کے مشاہدے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ حکومتیں خصوصاً وہ حکومتیں جن کے ہاں مختلف تہذیبی گروہ اور زبانیں پائی جاتی ہیں، یہ سمجھتی ہیں کہ واحد نشریاتی نظام ہی قومی یکجہتی کو برقرار رکھ سکتا ہے۔

کمیونٹی ریڈیو نشریات ایک دوسرے نقطۂ نظر سے عوامی خدمات کا ہی حصہ ہیں۔ البتہ اس کے کام کا انداز روایتی نشریات سے جداگانہ ہے۔ روایتی نشریات میں جہاں مواد کا انتخاب عوامی پالیسیوں کے تحت ہوتا ہے وہیں کمیونٹی ریڈیو میں نشریات کے انتخاب میں پالیسی کے بجائے عوامی نمائندگی کا خیال رکھا جاتا ہے۔

ہمارے ملک میں کمیونٹی ریڈیو اپنے حقیقی معنوں میں اب تک وجود نہیں رکھتا۔ یونیسکو کی مدد سے اور خود حکومت کی طرف سے اب تک جن کمیونٹی ریڈیو اسٹیشنوں کا قیام عمل میں آیا ہے ان کی شکل ادارہ جاتی ریڈیو (Campus/ institutional Radio) اسٹیشن کی ہے۔

ان کے علاوہ کچھ پروگرام جو غیر سرکاری اداروں کی مدد سے چلائے جا رہے ہیں ان کے پاس اپنا کوئی Infrastructure نہیں ہے۔ یہ ادارے اپنے طور پر کچھ پروگرام بناتے ہیں اور لمبی دوڑ دھوپ کے بعد کسی طرح F.M ریڈیو یا لوکل ریڈیو پر آدھے پونے گھنٹے کا وقت حاصل کر پاتے ہیں۔ ان میں سے چند اداروں کا تعارف درج ذیل ہے:

1۔ SEWA: کام کرنے والی عورتوں کی یہ ایک بہت بڑی یونین ہے جس کا مرکز گجرات ہے۔ تقریباً 7800,000 غریب عورتیں اس کی ممبر ہیں۔ 16 اپریل 2005 سے انھوں نے اپنا ایک پروگرام ''روڈی کا ریڈیو'' (Rudi no Radio) شروع کیا ان کا اپنا کوئی اسٹیشن نہیں ہے۔ بقول 'بالوبین' :Baluben

''چونکہ ایک مکمل اسٹوڈیو کا قیام ہماری دسترس سے باہر تھا لہٰذا ہم نے فیصلہ کیا کہ کسی نجی اسٹوڈیو میں پروگرام تیار کر کے کیسٹ آل انڈیا ریڈیو کے حوالے کر دیا جائے۔''[6]

اس کے پروگراموں میں' روڈی بین' عورتوں کی زندگی سے متعلق مختلف موضوعات پر معلوماتی نقطۂ نظر سے بات کرتی ہیں۔ اس کے موضوعات میں، خوراک، انشورنس، موسمی بیماریاں، پانی کا تحفظ جیسے عمومی مسائل کو سامنے رکھا جاتا ہے۔

2۔ ۔K.M.V.S. '' کچھ مہیلا وکاس سنگھٹن'': کچھ کے ایک سو پچاس گاؤں میں پھیلا ہوا عورتوں کا غیر سرکاری ادارہ ہے۔ کچھ کا سارس نام سے یہ ریڈیو سیریل 16 دسمبر 1999 کو شروع ہوا' اب تک اس کے 53 پروگرام آل انڈیا ریڈیو کے بھج اسٹیشن سے ریڈیو اُجاس (Radio Ujjas) پر نشر ہو چکے ہیں'۔[7]

بھج میں آئے زلزلہ کے بعد یہ پروگرام بند ہو گیا تھا۔ جنوری 2001 سے اسے دوبارہ جاری کیا گیا۔ مارچ 2001 میں اس پروگرام کو 'چمیلی دیوی ایوارڈ' سے نوازا گیا۔ یہ ایوارڈ میڈیا فاؤنڈیشن دہلی کی طرف سے دیا گیا تھا۔

مارچ 2001 سے K.M.V.S. نے 'درشٹی میڈیا' کی مدد سے ہفتے میں دو بار 15 منٹ کا ایک اور پروگرام شروع کیا جس کا نام تھا" زندہ رہنے کے لیے" اس پروگرام کے ذریعے لوگوں کو زلزلہ سے متعلق مختلف معلومات بہم پہنچائی جاتی تھیں۔

اس کا تیسرا ریڈیو سیریز "کچھ کے عوام کی آواز" (کچھ لوک جی وانی) جولائی 2002 میں شروع ہوا۔ اس کے تین حصے تھے۔ (1) پردہ فاش (2) مسافری (3) لوک وانی۔ K.M.V.S کے پروگرام انچارج سعید خاں کے مطابق وہ بہت جلد بچوں کا پروگرام بھی شروع کرنے والے ہیں۔

3۔ ریڈیو ایکٹیو پلامو Radio Active Plamu: نیشنل فاؤنڈیشن آف انڈیا اور انسٹیٹیوٹ فار انڈیا ڈیولپمینٹ کی کوششوں سے 5 اگست 2001 کو ڈالٹن گنج کے آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن سے اس کا پہلا پروگرام 'چلو ہو گاؤں میں' نشر ہوا۔ اب یہ پروگرام ہفتے میں دو دن بدھ اور اتوار کو نشر ہوتا ہے۔[8]

4۔ سمسکار پلان انٹرنیشنل (Samskar Plan International) نے آندھرا پردیش کے ضلع نظام آباد کے 76 گاؤں کے بچوں کو ساتھ لے کر اس پروگرام کو ترتیب دیا ہے۔ اس پروگرام کا نام ہے الاری مچھا تلو جس کے معنی ہوتے ہیں شوخی بھری باتیں۔ پروگرام کا یہ نام بچوں نے خود منتخب کیا ہے۔ اس پروگرام کی خصوصیت یہ ہے کہ بچوں کے ذریعے لکھے گئے اسکرپٹ کو بچوں ہی کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے۔

5۔ One world South Asia بین الاقوامی ادارہ One world network کا ایک حصہ ہے۔ OWSA کے نیٹ ورک میں 300 غیر سرکاری ادارے شامل ہیں، ہندوستان میں یہ 'پلان انٹرنیشنل' کے ساتھ راجستھان، اترانچل اور اڑیسہ میں کام کر رہا ہے۔ اپنے مشن Voicing the voiceless کے تحت 2004 میں نجی اداروں کے ساتھ مل کر اس نے ایک دنیا ایک آواز (EDEA) نام سے کمیونٹی ریڈیو پروگرام شروع کیا تھا۔ EDEA کے پروگرام AIR کے ایف ایم رینبو چینل سے بدھ کے دن شام 5 بجے نشر ہوتے ہیں۔ اس کے پروگرام جامعہ کے AJK,MCRC سے 90:4 پر بھی نشر ہوتے ہیں۔ اب تک OSWA نے ایک سو پروگرام بنائے ہیں جن کی CD متعلقہ نجی اداروں سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔ کچھ منتخب پروگراموں کو آن لائن بھی کیا گیا ہے جنھیں انٹرنیٹ سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس ادارے نے اترانچل، بیکانیر، اڑیسہ اور پانڈیچری میں بھی کمیونٹی ریڈیو سے دلچسپی رکھنے والے اداروں کے ساتھ مل کر ایک پلیٹ فارم بنانے کی کوشش کی ہے۔ OSWA' AIR روہتک اور AIR شملہ پر بھی اپنے پروگرام نشر کرتا ہے۔

6۔ نما دھونی۔ بنگلور کے ایک غیر سرکاری ادارے Voices نے 1999 میں ایک پروجیکٹ کے تحت کرناٹک کے ایک گاؤں Boodekote کو منتخب کیا اور وہاں سے نما دھونی (Namma Dhauni) یعنی" ہماری آواز" کی Narrow Casting کی ابتدا کی۔ اس کے پروگرام کیبل کے ذریعے ٹی وی پر نشر کیے جاتے ہیں۔ مگر اس میں Visual نہیں ہوتا۔ ان پروگراموں کو مخصوص ریڈیو سیٹ پر بھی سنا جا سکتا ہے جو بہت ہی کم قیمت پر دستیاب ہے۔ 'نما دھونی' کے تحت تعلیم، زراعت، صحت اور قانون جیسے موضوعات پر پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔ یہ پروگرام کنڑ، تیلگو، تمل اور اردو زبان میں نشر ہوتے ہیں۔

7۔ پلان انٹرنیشنل کا ریڈیو پروگرام 'چنوتی' بلوغت کے مسائل پر مبنی ہے۔ اس کا پہلا پروگرام 29 ستمبر 2004 کو نشر ہوا تھا۔ پلان بچوں کے مسائل سے متعلق ایک بین الاقوامی ادارہ ہے۔ 29 ستمبر کو" میری پہچان" نام کا پہلا پروگرام کرنے کے بعد اگلے ایک برس میں کل 26 پروگرام کیے۔ ان میں 'بھید بھاؤ'، اہم فیصلے، ایچ آئی وی، نشے کی عادت، اور ہماری ذمے داری اور یووا، وغیرہ جیسے اہم موضوعات شامل ہیں۔

8۔ ریڈیو راگھو منصور پور 1۔ یہ دنیا کا سب سے سستا ریڈیو اسٹیشن تھا جو بغیر کسی لائسنس کے مستقل تین سال تک بہار کے ویشالی ضلع میں چلتا رہا۔ راگھو نامی ایک 23 سالہ نوجوان جو بچپن سے ریڈیو کی مرمت کا کام کرتا تھا، اس نے ٹیپ ریکارڈوں کے پرانے پرزوں سے ایک ٹرانسمیٹر بنا ڈالا اور اس کے ذریعے 12 کیلو میٹر تک رسائی رکھنے والا ایک ریڈیو اسٹیشن تین سال تک چلاتا رہا۔ مارچ 2006 میں اچانک یہ کہانی بی بی سی (B.B.C) کے ذریعے منظر عام پر آئی اور پھر جنگل کی آگ کی طرح سائبر اسپیس سے اخبارات تک پھیل گئی۔

اس اسٹیشن سے بھوجپوری نغمے، بالی ووڈ کے فلمی نغمے اور عقیدت کے گیتوں کے علاوہ AIDS HIV تلاش گمشدہ، تیج تہوار اور اسکول کا نصاب بھی نشر کیا جاتا تھا۔

مارچ 2006 میں حکومت نے اس ریڈیو اسٹیشن کو غیر قانونی قرار دیتے ہوئے اس کے Instrument ضبط کر لیے اور راگھو مہتو کو ایک معاہدہ کرنا پڑا کہ وہ آئندہ کبھی بھی غیر قانونی نشریات کا مرتکب نہ ہوگا۔ مختلف غیر سرکاری اداروں اور غیر مقیم ہندوستانیوں نے اس کے لائسنس کے لیے مالی تعاون کا بیڑا اٹھایا ہے۔ حالانکہ اس کام میں خرچ بہت ہے۔

" ریڈیو راگھو' ہندوستان میں اپنی نوعیت کا پہلا ریڈیو ہو سکتا ہے لیکن عالمی منظر نامے میں غیر قانونی ریڈیو کی روایت نئی نہیں ہے۔ مغربی ممالک کے علاوہ حال ہی میں پاکستان میں 87 غیر قانونی ایف ایم ریڈیو اسٹیشن بند کیے گئے ہیں۔[9]

ہم اردو والوں کی حکومت ہند سے شکایت یہ رہی ہے کہ آزاد ہندوستان میں اردو کو اس کا جائز مقام نہیں دیا گیا۔ آل انڈیا ریڈیو اور دیگر ذرائع ابلاغ کے اداروں سے اس کا نام ونشان مٹا دینے کی کوشش کی گئی۔ جب یہ ممکن نہ ہوا تو اردو زبان کے تمام سرمائے کو ہندی کا نام دے دیا گیا۔ مسلسل 60 برسوں سے شکایت کرتے کرتے شاید ہمارے دل و دماغ سے خود کچھ کر گزرنے کا جذبہ ہی ختم ہو گیا ہے ورنہ کیا وجہ ہے کہ پچھلے دس برسوں میں جہاں ہندوستان سے مختلف زبانوں میں کمیونٹی ریڈیو کے پروگرام نشر ہو رہے ہیں وہاں اردو کا کوئی بھی ادارہ اب تک اس میدان میں نظر نہیں آتا۔

نجکاری کے اس دور میں کوئی بھی زبان کلیتہً حکومت وقت کی دست نگر رہ کر فروغ نہیں پا سکتی۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ جدید ترین ایجادات سے فائدہ اٹھایا جائے اور جو نئی ٹیکنالوجی بازار میں دستیاب ہے اور جو نئے راستے سامنے آئے ہیں ان پر چلتے ہوئے نئے جہانوں کے تسخیر کی سمت قدم بڑھایا جائے۔

حواشی:

1. ماہنامہ ''بسمل'' ص-36
2. سالنامہ ''ماس میڈیا'' 2003، ص-11
3. کمیونٹی ریڈیو ہینڈ بک یونیسکو
4. کمیونٹی ریڈیو ہینڈ بک یونیسکو
5. کمیونٹی ریڈیو ہینڈ بک یونیسکو
6. بروشر ''sewa''
7. بروشر ''کچھ مہیلا وکاس سنگھٹن''
8. بروشر ''ملک وکلیتیوں کی آواز''
9. روزنامہ ''عوام'' 26 مئی 2006

❑❑❑

پتہ:
29-Old
Brahmaputra Hostel,
JNU, New Delhi-110067

رام پرشاد بسمل کی آپ بیتی

مرتب: ڈاکٹر وشوامترا اپادھیائے/ مترجم: احسان احمد صدیقی

رام پرشاد نے یہ آپ بیتی گورکھ پور جیل میں اپنی پھانسی 19 دسمبر 1927 کے دو دن قبل مکمل کی تھی۔ رام پرشاد بسمل کے سینے میں جو آگ تھی اور جو مقصد پیش نظر تھا اس کا خلاصہ انھوں نے اس آپ بیتی میں بیان کیا ہے جس میں ان کی اپنی مفلوک الحال خانگی زندگی، نامساعد ایام، ایام جوانی، ازدواجی زندگی، والدین اور مذہبی و سیاسی تعلیمات کے ساتھ اپنے اندر پیدا ہونے والے حب وطن کے جذبے کی وجوہات، کاکوری ریلوے ڈکیتی، اپنی گرفتاری، جیل کے واقعات، پھانسی کی کوٹھری اور زندگی کے آخری لمحات کی باتیں بڑی دل خراش ہیں۔

صفحات: 109، قیمت -/33 روپے

تعلیمی تشکیل نو کے مسائل

مصنف: خواجہ غلام السیدین

یہ کتاب ماہر تعلیم خواجہ غلام السیدین کے ان مقالات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ملک و بیرون ملک کے سیمیناروں میں پڑھے تھے۔ ان مقالوں میں انھوں نے تعلیمی عمل کو تدریسی اور تنظیمی دونوں نوعیتوں سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ موجودہ دور میں تعلیمی، مادی، سماجی اور اخلاقی ترقی سے متعلق جتنی نئی نئی تحقیقات سامنے آ رہی ہیں اسی قدر ہم میں ناآسودگی اور بے چینی بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ ایسے میں محاسبے، تجزیے اور عمل میں کسی حتمی فیصلے تک پہنچنے کے لیے یہ کتاب ہماری ذہنی تربیت کرتی ہے۔

صفحات: 307، قیمت -/96 روپے

فرزانہ اسد

ماحول کی آلودگی اور ہماری ذمے داریاں

ہمارے دور کا متمدن انسان اجتماعی طور پر جن مسائل سے نبرد آزما ہے ان میں دہشت گردی اور فضائی آلودگی اہم ہیں۔ فضائی آلودگی کیا ہے اور اس سے انسانی زندگی کو کس قسم کے خطرات درپیش ہیں، اس کا اندازہ عام آدمی کو نہیں ہے لیکن جو لوگ اس کے مضر اثرات سے واقف ہیں ان کے ذہنوں میں خطرے کی گھنٹی بج چکی ہے۔ عالمی سطح پر اس سلسلے میں بیداری پیدا کرنے کی غرض سے گذشتہ کئی دہائیوں سے کوششیں جاری ہیں۔ کئی سرکاری اور غیر سرکاری ادارے مختلف ممالک میں اس سلسلے میں سرگرم عمل ہیں۔

ماحول دراصل آب و ہوا، موسم، قدرتی ذخائر، اور ان اشیا سے عبارت ہے جو ہمارے آس پاس ہیں۔ انسانی زندگی کی جذباتی، نفسیاتی، طبعی اور جسمانی نشو و نما میں ماحول کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ انسان اور دیگر جانداروں کی تمام ضروریات کی تکمیل کے لیے خدا نے مناسب ماحول عطا کیا ہے جس میں وہ ایک صحت مند زندگی گزار سکتا ہے۔ لیکن گذشتہ چند صدیوں کے دوران انسانی سرگرمیوں نے پوری دنیا میں قدرتی ماحول کو اس طرح خراب کیا ہے کہ بعض ماہرین کے خیال میں کرۂ ارض کا وجود خطرے میں پڑ گیا ہے۔ سائنسی ترقی نے جہاں ہمیں بے شمار ایجادات اور آرام و آسائش سے بہرہ ور کیا ہے وہیں اس تعمیر میں خرابی کی یہ صورت پیدا ہوئی کہ قدرتی ماحول کا توازن بگڑ گیا۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ سائنسی ایجادات نے صنعتی ترقی کو دنیا بھر میں عام کیا لیکن اس کے نتیجے میں شہروں کی توسیع اور جنگلوں کی کٹائی کا عمل شروع ہوا اور آبادی کے اضافے کے ساتھ ماحول میں تیزی سے تبدیلی پیدا ہونے لگی۔

اس دھوئیں میں جو کارخانوں سے نکلا، سلفر ڈائی آکسائیڈ اور نائٹروجن گیس موجود تھی جس نے Acid Rain کو جنم دیا۔ یہ زہریلی بارش زمین کی زرخیزی کے علاوہ پھلوں، سبزیوں اور فصلوں کے لیے بھی مضر ہے۔ اس سے متاثر ہونے والی غذائی اشیا جب انسانی جسم میں پہنچتی ہیں تو مہلک بیماریوں کو جنم دیتی ہیں۔

کارخانوں سے نکلنے والے استعمال شدہ پانی میں موجود زہریلے اجزا تالابوں، ندیوں اور سمندروں کے پانی کو بھی آلودہ کرتے ہیں۔ اس قسم کے پانی کے ذخائر میں موجود مچھلیوں کے استعمال سے انسانی جسم میں بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس پانی سے ہونے والی سینچائی سے اگنے والی غذائی فصلیں بھی صحت کے لیے مضر ہیں۔ 1858 میں انگلینڈ میں دریائے ٹیمس میں جب آلودگی بڑھنے لگی تو گھروں اور کارخانوں کے استعمال شدہ پانی کی نکاسی کے لیے متبادل انتظامات کیے گئے تھے۔ ہمارے ملک میں مذہبی طور پر مقدس سمجھی جانے والی ندی گنگا ان دنوں زبردست آلودگی کی شکار ہے۔

مشینوں، جہازوں، ریلوں، اور دیگر سواریوں کا شور ہوا کی آلودگی پیدا کرتا ہے۔ ہمارے ملک میں سیاسی، مذہبی اور سماجی تقاریب اور جلسے جلوس میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال عام ہے۔ ان مواقع پر مریضوں اور طلبہ کی بھی رعایت نہیں کی جاتی۔ اس سے مردم آزاری کے علاوہ فضائی آلودگی بھی پیدا ہوتی ہے اور سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اس سے کانوں کی بیماریوں مثلاً کم سنائی دینا یا مکمل بہرے پن کے علاوہ نفسیاتی بیماریاں بھی پیدا ہوسکتی ہیں۔ گذشتہ برسوں کے دوران اس سلسلے کے قوانین کو سختی سے نافذ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے جس سے عوام میں بیداری پیدا ہورہی ہے۔ تاہم اب بھی اس سلسلے میں عوامی بیداری کی ضرورت ہے۔

کوڑا کرکٹ، گندگی کے ڈھیر، کھلی نالیاں، تھمے ہوئے پانی کے ذخیرے نہ صرف فضا میں تعفن اور بدبو پیدا کرتے ہیں بلکہ مچھروں اور دیگر جراثیم کی پیدائش کا سبب بن کے بیماریوں کو کھلی دعوت دیتے ہیں۔

مذکورہ لاپرواہی سے انسانوں نے فضائی آلودگی کو بڑھایا ہے لیکن بعض ماہرین یہ مانتے ہیں کہ اس زمین کے لیے سب سے بڑا خطرہ گلوبل وارمنگ سے لاحق ہے، یہ ایک قدرتی وقوعہ ہے۔ زمین کا درجۂ حرارت بڑھنے لگا ہے جس کے سبب قطبین کی برف پگھل رہی ہے۔ اس برف کے پگھلنے سے دریاؤں کی سطح بلند ہونے اور سمندری طوفانوں کے امکانات میں اضافہ ہوا ہے۔ ایک رپورٹ میں کی گئی پیش گوئی کے مطابق اس صدی میں سمندروں کی سطح 28 سے 43 سینٹی میٹر تک بلند ہوجائے گی اور اس کا نقطۂ عروج یہ ہوگا کہ ہمالہ کی برف اور گلیشیر پگھل کر ندیوں میں زبردست طغیانی لائیں گے۔ اس سے سب سے زیادہ نقصان ان لوگوں کو پہنچے گا جو سمندروں اور دریاؤں کے کنارے آباد ہیں۔

1991 سے 2000 کی دہائی کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ اس دوران گذشتہ ایک سو پچاس برسوں کے مقابلے میں کرۂ ارض کی تپش سب سے زیادہ رہی۔ گلوبل وارمنگ کے دیگر اسباب آتش فشاں، شہاب ثاقب اور کشش ثقل میں پیدا ہونے والی تبدیلی ہے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ قدرتی مظاہر ہیں لیکن زمین کی تپش میں اضافے کا ذمے دار انسان بھی ہے۔ درختوں

اور جنگلات کی کٹائی سے زمینی تپش میں یقیناً اضافہ ہوا ہے۔ گذشتہ برسوں کے دوران کئی شہروں میں جہاں درجۂ حرارت بہت زیادہ تھا، کثیر تعداد میں درخت لگائے گئے، اس سے زمین کے درجۂ حرارت میں نمایاں کمی محسوس کی گئی۔

فضائی آلودگی کی کئی سطحیں ہیں اور ہر سطح پر اس کی روک تھام ضروری ہے۔ جنگلات کو کٹنے سے روکنا، نئے درختوں کا لگانا، کارخانوں سے خارج ہونے والے دھوئیں اور استعمال شدہ پانی سے جس میں کیمیاوی اجزا شامل ہوتے ہیں، زیرِ کاشت زمین اور پانی کے ذخائر کو محفوظ رکھنا اور سواریوں سے نکلنے والے دھوئیں کی روک تھام کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ گاڑیوں کو بجائے پیٹرول یا ڈیزل کے، گیس پر چلایا جائے۔ اب اس قسم کی کاریں استعمال کی جارہی ہیں۔ ایندھن کے طور پر استعمال ہونے والی لکڑی جس سے جنگلات کا نقصان تھا اور دھوئیں سے فضائی آلودگی پیدا ہوتی تھی، اس کی جگہ رسوئی گیس استعمال ہورہی ہے یہ بہتر ہے۔

فضائی آلودگی کی روک تھام کے لیے یہ ضروری ہے کہ شہریوں کو اس کے خطرات سے آگاہ کروایا جائے اور اس سلسلے میں بیداری پیدا کی جائے اسی کے ساتھ سرکاری طور پر ماحول کے تحفظ کے لیے بنائے گئے قوانین کو سختی کے ساتھ نافذ کیا جائے۔

□□□

پتہ:
30, Gulistan Colony,
Pandey Lance (West),
Jafar Nagar, Nagpur-44013

فورٹ ولیم کالج کے نسخۂ کلیات میر (مطبوعہ 1811) کے بعد کلام میر کا صحیح ترین اور مکمل ترین نسخہ

کلیات میر (دو جلدوں میں)

جلد اول (مکمل چھ دیوان غزلیات) صفحات: 870 ● قیمت 402 روپئے مجلد، 336 روپئے غیر مجلد ● سائز: 20X26X8

مرتب: ظل عباس عباسی ● بہ تصحیح و اضافہ: احمد محفوظ ● زیر نگرانی: شمس الرحمٰن فاروقی

جلد دوم (قصیدہ، مثنوی، مرثیہ وغیرہ) صفحات: 632 ● قیمت 430 روپئے مجلد، 410 روپئے غیر مجلد

تحقیق و ترتیب: احمد محفوظ ● زیر نگرانی: شمس الرحمٰن فاروقی

- اس نسخے کو تمام اہم اور قابل ذکر مطبوعہ نسخوں کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا ہے اور بقدر ضرورت قلمی نسخوں سے بھی مدد لی گئی ہے۔
- کلام میر میں مستعمل بے شمار نادر اور نامانوس الفاظ کی صحت و درستی کو بڑی حد تک یقینی بنایا گیا ہے۔
- نسخۂ عباسی جو صرف غزلیات پر مشتمل تھا اس میں نسخۂ محمود آباد سے بہت سارا کلام لے کر اضافہ کیا گیا ہے۔ اس طرح اب جلد اول میں غزلیات کی کل تعداد 1916 ہے جو ابھی تک کے تمام مطبوعہ نسخوں سے زیادہ ہے۔ غزلیات میں اشعار کی کل تعداد 13908 ہے۔
- جلد دوم میں میر کے تمام مرثیوں کو پہلی بار پوری صحت کے ساتھ مکمل صورت میں سامنے لایا گیا ہے۔
- جلد دوم میں منظومات کو پہلی بار بالکل نئی، مناسب اور بااصول ترتیب سے رکھا گیا ہے۔ اس طرح نسخے میں شامل کسی بھی منظومے کو تلاش کرلینا آسان ہوگیا ہے۔
- دونوں جلدوں میں متن کی تصحیح کے دوران مختلف مستند اور بعض نادر لغات اور فرہنگوں کا سہارا لیا گیا ہے۔
- جلد دوم میں دو تفصیلی دیباچے شامل ہیں۔ احمد محفوظ کے دیباچے میں کلام میر کی تدوین و تصحیح متن سے متعلق نہایت اہم امور زیر بحث لائے گئے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے دیباچے میں مثنویات میر اور میر کے عمومی کلام پر ایک بالکل نئے پہلو سے گفتگو کی گئی ہے۔
- جلد اول میں دیگر مضامین کے علاوہ شمس الرحمٰن فاروقی کا دیباچہ نما ایک نیا مضمون ''تمہید'' کے عنوان سے شامل ہے۔
- ان دونوں جلدوں کو بڑے سائز پر سفید کاغذ اور عمدہ کمپوزنگ کے ساتھ شائع کیا گیا ہے اور سرورق ایسا ہے جو میر کے زمانے کی تہذیبی و ثقافتی روایت کی عکاسی کرتا ہے۔

کلیات میر (جلد اول و دوم) ملک کے تمام بڑے کتب فروشوں کے یہاں دستیاب ہے۔ اردو کونسل سے براہ راست بھی طلب کی جاسکتی ہے۔

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

خلیل الرحمٰن اعظمی (ہماری مطبوعات سے)

نئے شعری رجحانات

زندگی ہی کی طرح شعروادب بھی اٹل اور جامد ہونے کے بجائے متحرک اور تغیر پذیر ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا فطری عمل اور ناگزیر حقیقت ہے جس کو ثابت کرنے کے لیے دلائل وشواہد اکٹھا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ شعروادب کے موضوعات ومسائل، طرزِ فکر وطرزِ احساس، اسالیب واظہار کے سانچے اگر نت نئی صورتیں اختیار نہ کریں تو تاریخ ادب کی اصطلاح بے معنی ہوجائے گی۔ جس زبان کا ادب ٹھہراؤ اور انجماد کا شکار ہوکر تغیر وتبدل کے دروازے اپنے اوپر بند کرلیتا ہے، اس زبان کا وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے۔

نئے ادب اور پرانے ادب یا نئی شاعری کے مسئلے کو اس طرح دیکھنا مناسب نہ ہوگا جس طرح ہم رات اور دن کو ایک دوسرے سے الگ کرتے ہیں۔ ادب کی تاریخ میں تبدیلیوں کا عمل اس طرح نہیں ہوتا کہ کوئی ایک تاریخ اور دن مقرر کرکے تمام ادیب پرانے ادب کی روایات اور اسالیب سے دست بردار ہوکر کوئی نئی چیز ایجاد کرلیں اور پھر سب کے سب متفقہ طور پر اسی سے وابستہ ہوجائیں۔ ادب اور نئی شاعری یا نئے رجحانات بھی پرانے ادب، پرانی شاعری یا پرانے رجحانات کے بطن سے جنم لیتے ہیں اور بعض نئے عناصر کی شمولیت کے باوجود کچھ پرانے عناصر بھی اپنے اندر رکھتے ہیں۔ نئے اور پرانے شاعر میں بنیادی فرق میرے نزدیک یہ ہے کہ پرانے شاعر کا ذہن ان نئے عناصر کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا جنھیں زندگی اور زمانے کی تبدیلیوں نے جنم دیا ہے۔ دوسری طرف وہ ان عناصر کو اپنے وجود سے خارج کرنا بھی پسند نہیں کرتا جو پرانی شاعری کے لیے تو ایک مؤثر قوت کی حیثیت رکھتے تھے، لیکن اب ان کی مدت حیات ختم ہوچکی ہے اور ان میں کسی قسم کی توانائی اور قوت نمو باقی نہیں رہی ہے گویا پرانا شاعر وہ ہے جو ماضی کو بجنسہٖ، زندہ رکھنے پر اصرار کرتا ہے۔ برخلاف اس کے نیا شاعر وہ ہے جو ماضی کے صرف ان عناصر کو برقرار رکھنا چاہتا ہے جن میں زندگی اور توانائی ہے اور بقیہ عناصر کو رد کردینا چاہتا ہے جو اس کے نزدیک مردہ روایات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نئی شاعری حقیقی معنوں میں وہ ہے جو ماضی کے صالح عناصر اور زندہ روایات کو بھی اپنے اندر رکھتی ہے اور کچھ تازہ عناصر اور تازہ روایات کی شمولیت کے سبب اس کا رنگ وآہنگ، اس کے اسالیب اور اس کا ذائقہ خاصا نیا اور بدلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ پرانے اسالیب اور پرانے ذائقے کے رسیا اسی لیے نئی شاعری سے اجنبیت محسوس کرتے ہیں۔ وہ نئی شاعری کے صرف اس عنصر سے لطف اندوز ہوسکتے ہیں جو پرانی اور نئی شاعری میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتا ہے یعنی نئی شاعری میں جتنا حصہ ماضی کا شامل ہے وہ تو ان کی دسترس میں آتا ہے لیکن وہ حصہ ان کی گرفت سے باہر نکل جاتا ہے جو زمانۂ حال کے تقاضوں کی پیداوار ہے۔ اس حصے کے بارے میں وہ طرح طرح کے شکوک و شبہات کا اظہار کرتے ہیں۔ کبھی اسے بدعت اور بے راہروی سے تعبیر کرتے ہیں، کبھی اسے نئے شاعروں کی سہل پسندی کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اور کبھی اس کے خلاف بڑے خلوص سے اس لیے مہم چلاتے ہیں کہ ان کے نزدیک یہ بدعتیں شاعری کو تباہ کردیں گی لیکن زمانہ ایسا بے درد ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ نئے لوگوں کو ہی تقویت پہنچاتا ہے اور نئی شاعری آہستہ آہستہ اپنی جگہ بنا کر رہتی ہے۔ زمانۂ حال اور ماضی قریب کے ان شعرا کے علاوہ ہر زمانے میں کچھ اور لوگ بھی ہوتے ہیں جو اپنے آپ کو پرانا شاعر کہتے ہیں۔ یہ ماضی قریب کے شعرا کے مقابلے میں بھی پرانے ہوتے ہیں، ان معنوں میں کہ یہ صرف پرانے عناصر کے وارث ہوتے ہیں جو اب بالکل مردہ ہوچکے ہوتے ہیں۔ ہمارے یہاں کے وہ استاد یا استاد نما شاعر اس زمرے میں آتے ہیں جو اب تک داغ و امیر یا ذوق وشاہ نصیر کی فنی روایات واسالیب اور ان کے موضوعات ومسائل کے وفادار ہیں اور ان سے سرمو انحراف کو کفر کے برابر سمجھتے ہیں۔ ایسے شاعروں کو روایتی شاعر کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ یہ اپنی شاعری کا مواد زندگی سے نہیں بلکہ بزرگوں کے دواوین سے لیتے ہیں۔ ردیف وقافیہ اور الفاظ کے تلازموں سے ہزار مرتبہ کے باندھے ہوئے مضامین کو پھر باندھتے رہتے ہیں۔ ہمارے یہاں مشاعروں نے اس روایتی اور کتابی شاعری کے فروغ میں خاصا حصہ لیا ہے اور اب تک مشاعروں میں اسی قسم کے شاعروں کی اکثریت ہوتی ہے۔

ہماری کلاسیکل شاعری جس کا آغاز امیر خسرو اور چندر بھان برہمن کی غزلوں اور متفرق شعروں اور محمد افضل کے ''بارہ ماسے'' سے ہوتا ہے اور جو دکنی

''مضامین نو'' سے ماخوذ، مرتب: **خلیل الرحمن اعظمی** / صفحات۔240، قیمت: -/172 روپئے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب %45 اور %40 کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

سے لے کر غالب تک مختلف منزلیں طے کرتی ہے، ہمارا بیش قیمت سرمایہ ہے۔ یہ شاعری مواد اور اسلوب دونوں اعتبار سے تراش خراش اور تبدیلیوں کے عمل سے گزری تھی اور اس کی بدولت اردو زبان کو جو توانائی نصیب ہوئی اس سے ادب کا کوئی طالب علم انکار نہیں کرسکتا۔ لیکن ہندوستان میں مغربی علوم، مغربی تہذیب اور مغربی نظام حکومت و سیاست نے ہمارے طرز فکر وطرز احساس کو تبدیلی و تغیر سے دوچار کیا جس کے نتیجے میں ہماری شاعری میں ایک نیا دور طلوع ہوا۔ حالی اور آزاد نے جب نئی نظم کا ڈول ڈالا تو اسے بھی اس ذہن نے قبول کرنے سے انکار کیا جو ماضی کا مکمل تابعدار اور وفادار تھا۔ چنانچہ نئی نظم کے ساتھ ساتھ پرانی شاعری بھی چلتی رہی۔ بیسویں صدی میں اقبال نے اسے ایک اور نیا موڑ دیا لیکن اقبال کے ہمعصروں میں بیخود، سائل، نوح ناروی اور احسن مارہروی وغیرہ بھی پرانے طرز کی شاعری بدستور کرتے رہے۔ بیسویں صدی کے پیچ در پیچ مسائل نے اور بھی بہت سے رجحانات کو فروغ دیا اور ہمارے یہاں شاعری کے رنگارنگ اسالیب جنم لیتے رہے۔ سیاسی، سماجی، معاشرتی اور تہذیبی سطح پر تبدیلی کا عمل اور اس کی رفتار بہت تیز ہوگئی ہے اس لیے پندرہ بیس برس کے بعد ہماری شاعری نئی کروٹیں لیتی ہے اور نئی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ بیسویں صدی کے ان نئے شعری رجحانات کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ موضوعات و مسائل اور طرز فکر و طرز احساس کی تبدیلیوں کے ساتھ اسالیب اور ہیئتوں میں بھی شکست و ریخت کا عمل جاری رہا ہے۔ پرانی اصناف اور پرانی ہیئتوں نے بھی نئے اثرات قبول کرکے اپنے اندر تازگی اور ندرت پیدا کی ہے۔ بیسویں صدی کی غزل بھی پرانی غزل سے خاصی مختلف ہوگئی ہے اور ندرت پیدا کی ہے۔ بیسویں صدی کی غزل بھی پرانی غزل سے خاصی مختلف ہوگئی ہے اور مختلف ہوتی جارہی ہے۔ پابند نظم نے خود اپنے سانچوں کو بتدیل کیا ہے اور لہجے اور اسلوب کی تبدیلیوں کے سبب پرانے طرز کی پابند نظم سے مختلف ہوتی جارہی ہے۔ مغربی شاعری کے اثر سے آزاد نظم، علامت نگاری، پیکر تراشی، صفات منتقلہ کا استعمال، الفاظ و تراکیب کے نئے سیاق و سباق بھی دریافت کیے گئے ہیں۔ 1935 کے بعد ترقی پسند تحریک اور حلقۂ ارباب ذوق کی قیادت میں اردو شاعری نے بہت سی منزلیں طے کی ہیں اور اس دور کے شعرا نے اپنے زمانے کے مسائل، اپنے زمانے کے انسانوں کے ذہنی اضطراب، خوابوں، تمناؤں اور ان کی جستجو اور جدوجہد کو جس نہج سے اپنے کلام میں پیش کیا ہے اس کی بدولت ہماری وہ شاعری پرانی معلوم ہونے لگی جو 1935 سے پہلے نئی شاعری یا نئی نظم کہی جاتی تھی۔ میری مراد اس شاعری سے ہے جسے اصلاحی، قومی، رومانی وغیرہ کے ناموں سے کسی زمانے میں یاد کیا جاتا تھا اور جس کے سائے میں حب وطن، مناظر فطرت اور شبابیات کی شاعری پھولی پھلی اور جوان ہوئی تھی۔ جن شعرا نے نئے اثرات کو تھوڑا بہت قبول کیا وہ ان تحریکوں کے ہم سفر ہوگئے جیسے جوش وغیرہ لیکن بہت سے شاعر اس زمانے میں پرانے معلوم ہونے لگے مثلاً اختر شیرانی، حفیظ جالندھری، ساغر نظامی، احسان دانش، روش صدیقی وغیرہ کیوں کہ شاعری کا کارواں اب آگے بڑھ گیا تھا اور یہ حضرات نئے تقاضوں سے اپنے آپ ہم کو آہنگ کرنے میں ناکام رہے۔

پچھلے دس برسوں سے پھر ہماری شاعری کچھ نئی کروٹیں لینے پر مجبور ہوگئی۔ طرز فکر، طرز احساس اور طرز بیان کے سانچے پھر ٹوٹ پھوٹ کر نت نئی شکلیں اختیار کرنے پر آمادہ ہیں اور شعرا کی ایک نئی نسل ہمارے سامنے آگئی ہے جو 1935 والی نئی شاعری سے غیر مطمئن ہے۔ یہ نئی شاعری اپنے پاس کیا نصب العین رکھتی ہے اور کس سمت میں سفر کرنا چاہتی ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو فطری طور پر ہمارے ذہن میں آتا ہے لیکن اس سوال کی تہہ میں خود ہمارا وہ مزاج اور شعور کام کررہا ہے جو اب تک 1935 والی نئی شاعری سے بہت زیادہ وابستہ رہا ہے یا اس سے پہلے کی نئی شاعری کے بارے میں اپنے کچھ معتقدات و تصورات سے کام لے کر رائے قائم کرتا رہا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ بیسویں صدی میں اب تک نئی شاعری کے جتنے رجحانات پروان چڑھے ہیں ان کی ایک مخصوص سمت رہی ہے، اس لیے اس شاعری پر ہم آسانی سے ایک لیبل لگا لیتے ہیں اور اسی نسبت سے شاعروں کو ایک خانے میں رکھ کر دیکھنے کے عادی ہوگئے ہیں قومی شاعر، سیاسی شاعر، رومانی شاعر، شبابیات کا شاعر، مناظر فطرت کا شاعر، شاعر انقلاب، شاعر مزدور، اشتراکی شاعر، رجائی شاعر، یاسیت پسند شاعر، خارجی موضوعات کا شاعر، داخلی موضوعات کا شاعر، غم جاناں کا شاعر، غم دوراں کا شاعر، ملکی شاعر، بین الاقوامی شاعر، آزاد نظم کا شاعر، ہیئت میں تجربے کرنے والا شاعر، پابند نظم کا شاعر، ترقی پسند شاعر، رجعت پسند شاعر، صحت مند شاعری، مریضانہ شاعری وغیرہ وغیرہ۔ یہ خانے شاعروں نے خود بنائے تھے یا اس زمانے کے سیاسی و سماجی عوامل نے بنائے تھے یا اس لیے بن گئے تھے کہ اس زمانے کی شاعری نقد و انتقاد کی انگلی پکڑ کر چلی تھی؟ تقریباً سبھی باتیں اس سلسلے میں کہی جاسکتی ہیں اور ان میں ایک حد تک صداقت ہے، یہ تحریکوں کا زمانہ تھا اور تحریکیں وجود میں آتی ہیں تو شعوری طور پر بعض نظریات و تصورات کی تبلیغ و تلقین کی جاتی ہے اور ان نظریات و تصورات کو بعض اوقات شاعر اپنے اوپر عائد کرلیتا ہے۔ نظریات و تصورات سے مکمل طور پر وابستہ ہوجانے میں شاعر کو کچھ فائدے بھی ہیں اور کچھ نقصانات بھی۔ فائدہ یہ کہ اسے بنی بنائی ایک لکیر یا سمت مل جاتی ہے جس پر وہ آنکھ بند کرکے چل دیتا ہے اور انھی نظریات و تصورات کی روشنی میں وہ اپنے آپ کو غیر متعلقہ مسائل یا غلط راستوں سے محفوظ رکھتا ہے اور اس پر گمراہی کا کم سے کم الزام عائد ہوتا ہے لیکن نقصان یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے تجربات و احساسات اپنی واردات و کیفیات پر

اعتماد کرکے آزادانہ تخلیقی عمل سے گزرنے اور حقائق تک خود پہنچنے کے بجائے وہ ان نظریات وتصورات کا ضرورت سے زیادہ وفادار بلکہ غلام ہوجاتا ہے اور اسی وفاداری کی وجہ سے بعض اوقات اپنے حقیقی محسوسات اور اپنی افتادِ طبع کو دبانے اور کچلنے کے لیے مجبور ہوجاتا ہے، شاعر کی افتادِ طبع، اس کے جذبات و محسوسات، اس کے تجربات وواردات اس کے نظریات وتصورات سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہوجائیں تو کیا کہنا لیکن یہ منصب ذرا کم ہی لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک مصنوعی اور غیر حقیقی فضا میں سانس لیتا ہے اور اپنی شاعری کی بنیاد ایسے مفروضہ موضوعات ومسائل پر رکھتا ہے جو اس کا حقیقی اور اصلی تجربہ نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس نوع کی شاعری تخلیقی آب ورنگ سے محروم ہوجاتی ہے۔ وہ ایک ڈھانچے کی طرح ہوتی ہے جس میں زندہ رہنے والی روح موجود نہیں ہوتی۔ ترقی پسند تحریک اور حلقۂ اربابِ ذوق کے شاعر دو الگ الگ سمتوں کے شاعر تھے لیکن ان شعرانے اپنے کو مخصوص تصورات کا ضرورت سے زیادہ پابند کرلیا تھا۔ اسی لیے ایک طرف ایسے شاعر زیادہ پیدا ہوئے جن کے پاس صرف موضوع ہی موضوع تھا تو دوسری طرف ایسے لوگ جن کے پاس محض ہیئت کے تجربے۔ ایک طرف محض خارج کی دنیا تھی تو دوسرے نے داخلی دنیا میں ہی اپنے آپ کو شعوری طور پر مقید کرلیا۔ یہ بات عام شاعروں کے بارے میں کہی جارہی ہے ورنہ دونوں سمتوں میں ایسے شاعر بھی موجود تھے جنھوں نے ان تحریکوں یا حلقوں سے وابستہ ہونے کے باوجود، اپنی شخصیت، اپنی افتادِ طبع اور اپنے تخلیقی عمل کے فطری مراحل کا لحاظ رکھا اور اسی سبب سے انھوں نے ایسی تخلیقات پیش کیں جن میں ادبی اور جمالیاتی قدریں پورے طور پر موجود ہیں۔

نئی شاعری دراصل اسی فنی رویے کے ردِعمل کے طور پر پیدا ہوئی ہے۔ کچھ تو اس کا سبب یہ بھی ہے کہ سیاسی وسماجی حالات نے پرانے عقائد و تصورات کی نارسائیوں کا پردہ چاک کردیا ہے اور نئی نسل کا ایمان ان سے اٹھ گیا ہے، دوسرا سبب 1935 کے نئے شاعروں کے ایک خاصے بڑے گروہ کی ہنگامی اور تجرباتی شاعری کی بے اثری کا احساس ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا نئی شاعری انھی خانوں اور حدبندیوں کے ٹوٹنے سے پیدا ہوئی ہے اسی لیے نئی شاعری پر تنقید وتبصرے کا کام بھی اب ذرا مشکل ہوگیا ہے۔ ترقی پسند تحریک اور حلقۂ اربابِ ذوق کے اپنے اپنے نقاد تھے جو اپنے نظریات اور ادبی عقائد کی روشنی میں اپنے شاعروں کی تشریح وتوضیح کرتے تھے اور انھیں سراہتے تھے۔ اپنے گروہ کے شاعر کو اچھا اور دوسرے گروہ کے شاعر کو برا کہنے کے لیے انھیں سراہتے تھے۔ اپنے گروہ کے شاعر کو اچھا اور دوسرے گروہ کے شاعر کو برا کہنے کے لیے انھیں بہت زیادہ غوروفکر سے کام لینے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کے سامنے ایک واضح لکیر تھی جس کے ایک طرف سب اچھے تھے اور دوسری طرف سب برے۔ ترقی پسند نقاد اپنے شاعروں کو سماج کا ہمدرد، باشعور، ایک روشن مستقبل کا پیغامبر، صحت مند خیالات کا علمبردار، وقت اور زمانے کا نباض بین الاقوامی شعور کا مالک اور انسانیت کا بہی خواہ اور دوسرے شاعروں کا سماج دشمن، داخلیت پرست، مریض، اپنی جبلتوں کا اسیر وغیرہ کہہ کر اپنے تنقیدی فرائض سے عہدہ برآ ہوجاتے تھے۔ اسی طرح حلقۂ اربابِ ذوق والے ترقی پسند شاعروں کو مبلغ، ڈھنڈورچی، ہنگامی اور صحافتی شاعر، فن سے بیگانہ وغیرہ کہہ کر انھیں رد کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ نیا شاعر اس تنقیدی رویے کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ نہ اپنے آپ پر لیبل لگانا چاہتا ہے اور نہ دوسرے پرانے شاعر پر۔ ان دونوں گروہوں میں سے ان شعرا کو اپنے قریب محسوس کرتا ہے جنھوں نے ان گروہوں سے وابستہ رہتے ہوئے بھی اپنے آپ کو کسی خانے میں بند نہیں کیا بلکہ اپنی تخلیقی شخصیت اپنی افتادِ طبع اور اپنے تجربات ومحسوسات کا لحاظ رکھا اور اسی بنا پر مؤثر اور قابلِ قدر تخلیقات پیش کیں۔ چنانچہ اختر الایمان، مختار صدیقی، مجید امجد، منیب الرحمٰن، عزیز احمد مدنی اور اس نوع کے شاعروں سے نئی نسل کے شاعر ذہنی طور پر قربت محسوس کررہے ہیں، اور فیض، راشد، میراجی، مخدوم، سردار جعفری وغیرہ نے اسلوب واظہار کے جو تجربے کیے تھے اس سے حسبِ توفیق فائدہ اٹھانے کی بھی کوشش کررہے ہیں۔

چونکہ نئی شاعری خانوں اور حدبندیوں کے ٹوٹنے سے پیدا ہوئی ہے اس لیے نئے شاعروں پر کوئی لیبل نہیں لگایا جاسکتا نہ کوئی ایسی بات کہی جاسکتی ہے جو سب پر صادق آتی ہو۔ کسی ایک خصوصیت یا صفت یا کسی شاعر کے فنی رویے یا کسی ایک شاعر کی کسی ایک نظم یا غزل کو سامنے رکھ کر اور اس سے کچھ نتائج نکال کر اگر انھیں پوری نئی شاعری یا نئی نسل پر منطبق کرنے کی کوشش کی جائے گی تو وہ اب زیادہ کامیاب نہیں ہوسکتی، اس لیے کہ اس کی ایک خصوصیت کو اگر ہم اس دور کی ساری نئی شاعری پر چسپاں کرنا چاہیں گے تو اس کا بہت سا حصہ اس کے دائرے سے نکل جائے گا اسی طرح کسی ایک کیفیت کو ہم نئی شاعری کی پہچان بتائیں گے تو ہمیں خود محسوس ہوگا کہ یہ کیفیت سب شاعروں کے یہاں نہیں ہے بلکہ بعض اوقات ایک ہی شاعر کی ایک نظم یا غزل میں موجود ہوگی تو دوسری نظم یا غزل کسی اور کیفیت کا پتہ دے گی۔ غرض یہ کہ اس دور کی نئی شاعری کی سب سے نمایاں صفت اس کی رنگارنگی ہے۔ ایک ہی شاعر کے یہاں بعض اوقات تنوع ملے گا۔ وہ کسی ایک نظم میں داخلی شاعر معلوم ہوگا تو دوسری نظم میں خارجی تجربے کو برتنے کی کوشش کررہا ہوگا اور کسی تیسری نظم میں داخلیت اور خارجیت کے امتزاج یا ٹکراؤ سے ایک تیسری کیفیت جنم لیتی ہوئی معلوم ہوگی۔ کسی شاعر کی ایک نظم ناکام اور بے کیف ہوگی تو دوسری نظم میں اس کا تخلیقی عمل کامیاب ہوتا نظر آئے گا، اس لیے پرانے نقادوں کی دشواری ہماری سمجھ میں آسکتی ہے۔ وہ اب تک کسی ایک شاعر یا کسی شاعر کی ایک نظم پر عملی تنقید کرنے

کے بجائے رجحانات پر مضامین لکھنے کے عادی رہے ہیں۔ رجحانات پر مضمون لکھنے میں آسانی یہ ہوتی ہے کہ کسی نظم یا شعری تخلیق کے اندر جانے اور اس کا مکمل تجزیہ کرکے اس کے ادبی و جمالیاتی محاسن و معائب کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کے بجائے کسی موضوع کو خارجی طور پر سامنے رکھ کر اس پر لکھی گئی سب چیزوں کا سروے کر ڈالا اور اعلیٰ، اوسط، ادنیٰ ہر طرح کی ادبی تخلیق کا ایک ہی سانس میں ذکر کرتے گئے اور پھر آخر میں اس رجحان سے وابستہ سب شاعروں کو ان کے محنت کی داد دے دی۔ ہندوستان کی آزادی میں اردو شاعروں کا حصہ، اردو شاعری اور حب الوطنی، اردو شاعری میں سماجی شعور، اردو شاعری اور قحط بنگال، اردو شاعری اور عالمی جنگ، اردو شاعری اور تقسیم ہند، اردو شاعری اور فسادات، اردو شاعری اور امن، اردو شاعری اور بین الاقوامی شعور، اردو شاعری اور رومانیت، اردو شاعری میں مناظر فطرت۔ غرض کہ اس طرح موضوع قائم کرکے نظموں اور شاعروں کی فہرست جمع کیجیے اور ان نظموں کا خلاصہ نثر میں لکھنے کے بعد ان کے کچھ اقتباسات دے دیجیے۔ چلیے ایک تنقیدی مضمون ہوگیا۔ میرا خیال ہے کہ اس طرح کے نقادوں کے لیے نئی شاعری اپنے ساتھ بڑی مصیبتیں لائی ہے میں نے ادھر کچھ مضامین نئی شاعری پر پرانے نقادوں کے دیکھے جن میں یہ کہا گیا ہے کہ نئے شاعروں کی نظمیں سمجھ میں نہیں آتیں، نئے شاعر اپنے اپنے ذاتی خول میں بند ہوگئے، ان کے یہاں اپنے زمانے کا کوئی شعور نہیں ہے۔ یہ داخلیت کی بھول بھلیاں میں قید ہیں، یہ صرف ٹیڑھی میڑھی نظمیں لکھ رہے ہیں اور ہیئت پرستی کی طرف مائل ہیں۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ پر صحیح ہیں اور بعض نئے شاعروں کے یہاں یہ باتیں موجود ہیں لیکن ان کے علاوہ بھی نئے شاعروں کے یہاں بہت کچھ ہے اور ان شاعروں کے علاوہ بھی نئے شاعر ہیں چونکہ نقادوں کو یہ اندیشہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو اس لیے وہ نام لینے یا مثالیں دینے سے گریز کرتے ہیں کیوں کہ مثالیں دینے کے بعد اس بات کی پرکھ بھی کی جاسکتی ہے کہ آیا نقاد جو کچھ کہہ رہا ہے وہ صحیح ہے یا وہ خود کسی غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ دوسرے یہ کہ ان کے برخلاف دوسری طرف کی مثالیں پیش کی جائیں گی تو پھر اس تنقید کا بھرم کھل جائے گا۔

میں سمجھتا ہوں کہ نئی شاعری کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے فہرست سازی، سروے اور خالص نظریاتی تنقید کو بے معنی بنا کر رکھ دیا ہے اور عملی تجزیاتی تنقید کی ضرورت کا شدید احساس دلایا ہے۔ یہ توقع رکھنا کہ شعروادب کی تاریخ میں کوئی ایسا زمانہ آئے گا جب صرف اچھے شاعر پیدا ہوں گے یا کوئی شاعر صرف اعلیٰ درجے کی چیزیں لکھے گا یا کسی شاعر کو ہر نظم یا ہر غزل کے لکھنے میں یکساں کامیابی ہوگی نہ صرف ناجائز بلکہ فضول اور مہمل توقع ہے۔ نقاد کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے زمانے کی تخلیقات کو سمجھنے اور ان سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرے۔ اپنے دور کے طرز احساس، طرز فکر اور آہنگ و اسلوب سے موانست پیدا کرنے کی کوشش کرے اور ماضی و حال کے ربط کو سمجھ کر فنی تخلیقات کی گہرائیوں میں جاکر ان کی کامیابی یا ان کی ناکامی کا راز معلوم کرے ہمارے پرانے تنقید نگار اگر اس مشکل کام کرنے کے لیے تیار نہیں اور پرانے طریقے سے ہی لیبل اور خانے بنا بنا کر کام چلانا چاہتے ہیں تو نئی شاعری کا مسئلہ ان کے لیے ہمیشہ دردسر بنا رہے گا اور نئی شاعری انھیں اسی حالت میں چھوڑ کر آگے بڑھتی رہے گی۔

گذشتہ دس پندرہ برسوں میں اردو کے نئے شاعروں کے یہاں زندگی کو ایک مکمل اکائی کی حیثیت سے دیکھنے، سمجھنے اور برتنے کا جو رجحان سامنے آیا ہے وہی اس نسل کا سب سے بڑا اکتساب ہے۔ داخلیت، خارجیت، مواد اور ہیئت، ذات اور کائنات، غم جاناں اور غم دوراں، بڑے موضوعات اور چھوٹے موضوعات ان سب کی تقسیم اور انھیں علاحدہ علاحدہ سمجھ کر کسی ایک کو رد اور دوسرے کو قبول کرنے یا اپنے اوپر مسلط کرنے کو نیا شاعر ایک غیر فطری عمل سمجھتا ہے۔ وہ خارجی دنیا اور داخلی دنیا کو الگ الگ کرکے دیکھنے کا قائل نہیں بلکہ ان دونوں کے گہرے ربط کو سمجھنا چاہتا ہے۔ وہ فرد اور سماج دونوں کو الگ الگ نہیں بلکہ ایک دوسرے کا لازمہ قرار دیتا ہے۔ وہ شاعری کو اجتماعی خیالات کا منظوم بیان نہیں سمجھتا بلکہ اسے زندگی کے تجربات و مشاہدات کا ایسا تخلیقی اظہار سمجھتا ہے جو اس کی اپنی شخصیت، اس کے مزاج اور اس کے محسوسات سے ہم آہنگ ہوکر ایک منفرد پیکر اختیار کرلے۔ وہ شاعری کو جماعتی کورس کے بجائے انفرادی تخلیقی عمل سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک ہر شاعر اپنی جگہ پر ایک منفرد وجود ہے اور اس کی ہر نظم خود اپنی جگہ ایک منفرد اکائی ہے۔ انفرادی اسلوب اور طرز کی اہمیت اس زمانے میں زیادہ بڑھ گئی ہے جب کہ گذشتہ ادوار میں عمومی اسلوب اور یکساں انداز بیان کو برتنے کا رجحان عام تھا۔

میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ نئے شاعروں میں ہر شاعر کو یا ایک شاعر کی ہر نظم یا غزل کو کسی ایک پیمانے سے جانچنا غلط ہوگا۔ ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ ایک ایسے زمانے میں جب اردو زبان بعض پیچیدہ اور صبر آزما مراحل سے گزر رہی ہے اردو کا نیا شاعر اس زبان میں شاعری کی نت نئی دنیاؤں کی جستجو میں سرگرم ہے۔ وہ طرح طرح کے موضوعات، طرح طرح کی کیفیات اور طرح طرح کے اسالیب کو برتنے کی کوشش کررہا ہے۔ وہ کبھی ناکام ہوتا ہے اور کبھی کامیاب، وہ کبھی محدود ہوجاتا ہے اور کبھی لامحدود فضاؤں میں پرواز کرنا چاہتا ہے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی آج کے دور میں زیادہ اچھی چیزیں لکھی جارہی ہیں اور پچھلے دنوں جن پرانے نقادوں نے جمود کا نعرہ لگایا تھا، ان کی آنکھیں اس ہماہمی اور ہلچل کو دیکھ کر چکاچوند ہوگئی ہیں۔

یہ شعرا مختلف طرح کے معتقدات، رجحانات، موضوعات اور ان کے برتنے کے مختلف اسالیب لے کر سامنے آئے ہیں۔ ان سب کو پسند کرنا ضروری

نہیں، نہ یہ سمجھنا ضروری ہے کہ یہ جو کچھ لکھ رہے ہیں وہ ہر حال میں اچھی شاعری کا نمونہ ہے، البتہ یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ یہ شعرا مل کر موجودہ دور کے شعری مزاج کی تشکیل کر رہے ہیں۔ ان کے محاسن و معائب کو بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔ بیشک یہ شاعری ہمت افزائی کی بھی مستحق ہے لیکن اس پر کڑی تنقید بھی ضروری ہے۔ یہ تنقید مجرد اور عمومی نہیں ہونی چاہیے، بلکہ واشگاف، تجزیاتی اور نام بنام ہونی چاہیے۔ جب شعروادب میں نئے رجحانات شروع ہوتے ہیں تو اپنے ساتھ خوبیوں کے ساتھ بہت سی خرابیاں بھی لاتے ہیں جس طرح موسم تبدیل ہونے پر بہت سی بیماریاں پھیلنے لگتی ہیں۔ اسی طرح نئے پن اور جدت پسندی کے سیلاب میں بعض غیر فطری عناصر بھی سامنے آتے ہیں۔ جدیدیت اور جدت میں فرق کرنے کی ایسے زمانے میں بیحد ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ صالح قسم کی جدیدیت وہ ہے جو وقت اور ماحول کے فطری تقاضوں اور ادیب کے اپنے احساس اور تجربے سے پیدا ہوئی ہو، یہ جدیدیت خلا میں لٹکی ہوئی نہیں ہوتی بلکہ اس کی جڑیں اپنی روایت میں ہوتی ہیں جو شاعری اپنے ماضی سے بالکل کٹ کر جدید ہوگی وہ صحیح معنوں میں جدید بھی نہ ہوگی۔ اس میں انوکھا پن کا چونکانے کا انداز تو ہوگا جو وقتی طور پر ہماری توجہ کو اپنی طرف مبذول کرسکتا ہے لیکن اس کا آب و رنگ بہت جلد پھیکا پڑ جائے گا اور کچھ ہی دنوں میں یہ نیا پن پرانے پن میں تبدیل ہوجائے گا۔ نئی اور پرانی شاعری میں اس قسم کا فرق نہیں ہوتا جو نئے اور پرانے اخبار میں ہوتا ہے اور نہ ہی بقول شخصے ادب میں عجائب خانے اور میوزیم ہوتے ہیں۔ اچھی اور معتبر شاعری اپنے زمانے کی پیداوار ہونے کے باوجود ہر زمانے کے لیے اپنے اندر کشش رکھتی ہے اور اگلی نسلوں کے لیے بھی وہ زندہ اور جیتی جاگتی حقیقت ہوتی ہے ورنہ دانتے، شیکسپیئر، کالیداس، حافظ، میر، غالب اور ٹیگور کا کلام آج نہ پڑھا جاتا اور اس کی جگہ لوگوں کے دلوں کے بجائے تہہ خانوں اور مقبروں میں ہوتی۔ کسی نے بڑی اچھی بات کہی ہے کہ ہر اچھا ادب روح عصر کی پیداوار ہوتے ہوئے ماورائے عصر بھی ہوتا ہے۔

یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ترقی پسند تحریک اور حلقۂ ارباب ذوق کے تجربوں اور ان کی غلطیوں سے نئی نسل کو ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے۔ ترقی پسندوں اور حلقۂ ارباب ذوق والوں میں سے بعض نے ترقی پسندی یا جدت کے فارمولے بنا لیے تھے۔ ترقی پسندوں نے ماضی کے ادب کو جاگیردارانہ سماج کی پیداوار سمجھ کر حقارت سے ٹھکرایا اور غزل کو قدامت پسندی کی علامت قرار دیا۔ اسی طرح حلقۂ ارباب ذوق کے بعض شاعروں نے محض آزاد نظم لکھنے، لاشعور اور تحت الشعور کی بھول بھلیاں بنانے یا بعض اسلوبی جدتوں کا ایک نسخہ بنالینے کو ہی جدیدیت کی پہچان قرار دیا۔ فارمولے اور نسخے کی مدد سے جو شاعری وجود میں آتی ہے وہ عام طور پر کم عیار ہوتی ہے اور اس کی عمر بہت کم ہوتی ہے۔ نئے شاعروں میں بھی اگر کچھ لوگ جدیدیت کے فارمولے بناتے ہیں صرف آزاد نظم کو جدید شاعری کی واحد پہچان سمجھتے ہیں یا غزل میں میز، کرسی اور کتے، بلی کے الفاظ کثرت سے استعمال کرکے نئی غزل لکھنے کا نسخہ بنا رہے ہیں۔ کچھ لوگ اگر سارتر اور کامیو کے اقوال سن کر جا و بیجا انھیں اگل رہے ہیں یا محض کھردرے الفاظ، تاثر اشیدہ تراکیب اور نثری پیرایۂ زبان میں کچھ غیر ہضم شدہ خیالات کو الٹے سیدھے لکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بہت زیادہ نئی شاعری کر رہے ہیں تو یہ ان کی بڑی بھول ہے۔ اس قسم کی جعلی جدیدیت اور اس طرح کی مصنوعی اور جھوٹی نئی شاعری کا پردہ اسی وقت چاک ہوسکتا ہے جب ہمارے تنقید لکھنے والے نہایت جرأت اور بیباکی کے ساتھ آج کی شعری پیداوار کا الگ الگ تجزیہ و تبصرہ کریں گے اور کھرے کھوٹے میں فرق کرکے بلیغ، تہہ دار اور دلپذیر فن پاروں کی خوبیوں کو اجاگر کریں گے۔ نئی نسل کے نقاد کا کام نئی شاعری کا اشتہار دینا یا بھائی بندوں میں حصہ تقسیم کرنا نہیں بلکہ اصل اور نقل میں تمیز کی قوت کو بیدار کرنا ہے۔

□□□

انیس کے سلام

مرتب: علی جواد زیدی

غزل کے تشکیلی مزاج میں عشق، اور سلام کو اعتقاد کے طور پر انفرادیت حاصل ہے۔ یہ وہ اعتقاد ہے جس میں اخلاقی، منقبتی، رثائی، مدحیہ اور بھکتی جیسے موضوعات شامل ہوتے ہیں۔ ابتدائی دور کے سلام پر اعتقاد کی ہی فضا چھائی ہوئی تھی لیکن یہی صنف جب انیس تک پہنچی تو اس میں ایک جدید ادبی لب و لہجہ قائم ہوا۔ انیس نے سلام میں رثائی موضوعات کے علاوہ ذاتی مسائل، زمانے کی ناقدری، معاصرانہ چشمک اور بلند خیالی جیسے مضامین کو جگہ دی۔

''انیس کے سلام'' مرتبہ علی جواد زیدی میں انیس کے تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ سلام شامل ہیں جس میں سلاموں کی تعداد 102 ہے۔

صفحات: 307، قیمت -/60 روپے

کبیر احمد جائسی

(ہماری مطبوعات سے)

ہند اسلامی تہذیب کے ایرانی اور زردشتی عناصر

ہندوستان میں اسلام جن لوگوں کے ذریعے پھیلا ان میں سے زیادہ تر افراد وسط ایشیا اور ایران سے آئے تھے۔ ان میں بہت سے خانوادے ایسے بھی تھے جن کے آبا و اجدا تو اصلاً عرب تھے مگر ان کو ایران اور وسط ایشیا میں رہتے ہوئے اتنی مدت گزر چکی تھی کہ یہ لوگ بھی فکر و عمل کے لحاظ سے ایرانی یا وسطِ ایشیائی بن چکے تھے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ایران اور وسطِ ایشیا سے آنے والے افراد نے تو اپنے آئین و آداب کی بڑی حد تک حفاظت کی اور ان کو ہندوستان کی فضا میں اس طرح رچا بسا دیا کہ وہ ہندوستانی معلوم ہونے لگے، مگر وہ عرب جو وقتاً فوقتاً غزوات، جہاد یا تجارت کے سلسلے میں ایران یا وسطِ ایشیا کی طرف ہجرت کرتے رہے وہ خود ایرانی یا وسطِ ایشیائی معاشرے میں کچھ اس طرح گھل مل گئے کہ ان کی ''عربیت'' افسانۂ پارینہ معلوم ہونے لگی اور وہ ایرانی آئین و تہذیب کے نمائندے بن کر دنیا کے سامنے ابھرے اور زندگی کے ہر شعبے پر اپنے ان مٹ اثرات چھوڑ گئے۔ ایران اور وسطِ ایشیائی معاشرے میں عرب اس طرح کیوں جذب ہوئے؟ اور ان کی اصل خصوصیات کیوں باقی اور برقرار نہ رہ سکیں؟ اس موضوع پر تو پھر کبھی اظہار خیال کیا جائے گا، اس وقت تو صرف اتنا ہی عرض کرنا مقصود ہے کہ ہندوستان میں جو اسلام پھیلا وہ براہ راست عرب سے نہیں بلکہ ایران اور وسطِ ایشیا سے آیا تھا اور اسلام کے آنے کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں جو تہذیب پروان چڑھی اور بعد میں اسلامی تہذیب کے نام سے موسوم ہوئی وہ دراصل ایرانی اور وسطِ ایشیائی تہذیب تھی جس میں اسلامی عناصر بھی شامل ہوگئے تھے۔ اس تہذیب نے ہندوستان کی معاشرت، بولیوں، زبانوں، مصوری، موسیقی، ادب، فنِ تعمیر غرض کی زندگی کے ہر شعبے پر اپنے بہت گہرے اور دوررس اثرات چھوڑے ہیں جن کے مظاہر آج کے ہندوستان میں بھی قدم قدم پر نظر آتے ہیں۔

ایرانی اور وسطِ ایشیائی مسلمان مذکورہ تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ ایک چیز اور بھی ہندوستان لائے جو وقت اور زمانے کے گزرنے کے ساتھ ہندوستانی معاشرے میں اس طرح گھل مل گئی کہ اب وہ خالص ہندوستانی چیز معلوم ہوتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے جو اوّلین دستے آئے وہ انتہا سے زیادہ مذہبی رواداری کے حامل تھے، وہ اپنے ساتھ صرف اسلامی تصورات ہی نہیں لائے بلکہ ان کے جلو میں وہ قدیم ایرانی اور زردشتی تصورات بھی ہندوستان میں داخل ہوئے جو ان ایرانی اور وسط ایشیائی مسلمانوں کے لیے اجتماعی لاشعور کا درجہ رکھتے تھے یعنی یہ وہ تصورات تھے جو ان کے آبا و اجداد کے ذریعے انھیں ورثے کے طور پر ملے تھے۔ اس ورثہ کو انھوں نے نہ صرف محفوظ رکھا بلکہ اپنے ساتھ ہندوستان لا کر اس کو ایک ایسے سانچے میں ڈھال لیا جو خالص ہندوستانی سانچا کہا جاسکتا ہے۔

ہندوستان آنے والے ان مسلمانوں کے اس عمل کو چاہے جس نام سے یاد کیجیے، اس کو ان کی عرب دشمنی سمجھیے یا کچھ اور، مگر حقیقت یہ ہے کہ ان ہی مسلمانوں کے اثر سے ہندوستان کے لوگ قدیم ایرانی و تورانی بادشاہوں، بہادروں، ہیروؤں، زشت کرداروں اور زردشتی تصورات سے نہ صرف آشنا ہوئے بلکہ ان سے اس طرح متاثر ہوئے کہ ان ایرانی الفاظ کو اپنے ذخیرۂ الفاظ میں شامل کر کے ہندوستانی ذخیرۂ الفاظ کو وسیع کیا اور ان الفاظ کو نئے نئے معنی و مفاہیم بھی عطا کیے۔

اصل موضوع پر اظہار خیال کرنے سے پہلے ایک نکتہ کی وضاحت ضروری معلوم ہوئی ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ جن قدیم ایرانی اور زردشتی تصورات کی طرف گزشتہ سطور میں اشارہ کیا گیا ہے وہ مسلمانوں کے ذریعے نہیں بلکہ ان پارسی مہاجرین کے ذریعے ہندوستان میں عام ہوئے ہوں گے جو ایران سے ترکِ وطن کر کے ہندوستان میں بس گئے تھے۔ ہمارے خیال میں ایسا کہنا درست نہ ہوگا، اس کی وجہ یہ ہے کہ جو پارسی ہندوستان میں بس گئے تھے انھوں نے اپنی نسلی اور مذہبی شناخت برقرار رکھنے کے لیے نہ صرف اوستائی رسمِ خط کو برقرار رکھا تھا بلکہ اپنے عبادت خانے اور مذہبی کتابوں کو بھی دوسروں کی نظر و دسترس سے مخفی رکھتے تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ عرصۂ دراز تک وہ ہندوستان کے لوگوں سے رسمی اور کاروباری تعلقات رکھنے کے باوجود نہ تو وہ خود کسی سے متاثر

''ہند۔ایرانی ادبیات'' (چند مطالعے) سے ماخوذ، مصنف: کبیر احمد جائسی / صفحات۔190 ، قیمت : -/250روپئے

نوٹ : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔ ادارہ

ہوئے اور نہ ہی انھوں نے ہندوستان کے کسی فرقہ یا طبقہ پر اپنا کوئی گہرا اور دیرپا اثر چھوڑا۔ ان پارسیوں کو جب ہندوستان میں رہتے رہتے ایک مدت گزر گئی تو انھوں نے محسوس کیا کہ ان کو اپنے گنبدِ بے در سے نکل کر کھلی اور آزاد فضا میں سانس لینی چاہیے۔ اس احساس کو انھوں نے جب عملی جامہ پہنایا تو ان سے ایک چوک ہوگئی۔ انھوں نے اپنے اظہار خیال اور مذہبی تبلیغ کے لیے جس زبان کا انتخاب کیا وہ کوئی ہندوستان گیر زبان نہ تھی بلکہ ایک علاقائی زبان تھی جس کا دائرۂ کار واثر بہت محدود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہندوستانی زبان، گجراتی، اختیار کر لینے کے باوجود ایک عرصۂ دراز تک پارسی حضرات ہندوستان کے دوسرے فرقوں کے لوگوں سے کٹے کٹے رہے۔ ان کے جو مذہبی تصورات وافکار ہندوستانیوں میں عام ہوئے وہ ان مسلمانوں کی کوششوں کا نتیجہ تھے جو ایران اور وسطِ ایشیا سے ترکِ وطن کر کے ہندوستان آئے تھے، اس سلسلے میں خود پارسیوں نے نہ تو کوئی کوشش کی اور نہ ہی ایسا کرنا ان کی تہذیبی اور نسلی شناخت کے لیے مفید تھا۔

ہم اپنے اس مطالعے کا آغاز پہلے ان الفاظ اور تصورات سے کرتے ہیں جو یا تو فارسی باستان کے الفاظ ہیں یا اوستائی زبان کے، لیکن ان کو ہندوستانی مسلمانوں نے اس طرح اپنے مذہبی تصورات کا جز بنا لیا ہے کہ ان کا غیر عربی یا یوں کہیے کہ غیر اسلامی الفاظ ہونا محسوس تک نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر یہاں چند وہ اسما پیش کیے جاتے ہیں جو آج کے ہندوستانی معاشرہ کے جانے پہچانے اسما ہیں اور جن کے مترادفات عربی زبان میں موجود ہیں مگر وسط ایشیائی او رایرانی مسلمانوں کے اثرات سے ہندوستانی مسلمان ان ہی غیر عربی اسما اور اصطلاحات میں اپنے مذہبی تصورات وخیالات کو ظاہر کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان چند الفاظ پر غور فرمائیں۔ خدا، ایزد و یزدان، سروش، رستخیز یا رستاخیز، نماز، فرشتہ، اہریمن یا اہرمن، بہشت و دوزخ۔

یہ سارے کے سارے الفاظ کسی نہ کسی شکل میں پہلوی یا اوستائی زبان میں موجود تھے اور ان کے معنی بھی آج کے مروج معنی سے مختلف تھے۔ سب سے پہلے خدا کا لفظ لیجیے جو ہندوستانی مسلمانوں میں اللہ کے لفظ کے مترادف کے طور پر نہ صرف یہ کہ مستعمل ہے بلکہ اللہ کے لفظ کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ لفظ پہلوی الاصل ہے۔ پروفیسر نذیر احمد صاحب نے اپنے ایک مقالے میں تحریر فرمایا ہے کہ پہلوی اشکانی میں اس کا تلفظ خوتاذ، پہلوی ساسانی میں خوتای اور پاژند میں خودائے، پہلوی اور پاژند دونوں میں اس لفظ کے معنی بادشاہ کے تھے اور یہ لفظ کبھی بھی اللہ کے معنوں میں استعمال نہ ہوتا تھا۔ یہ لفظ ایرانی اور وسطِ ایشیائی مسلمانوں کے ہمراہ ہندوستان آیا جس سے شہنشاہیت اور بادشاہت کا تصور تو بالکل مفقود ہوگیا اور یہ لفظ صرف اللہ کے لفظ کے مترادف کے طور پر استعمال ہونے لگا، چنانچہ آج بھی اللہ کے لفظ کے مقابلے میں خدا کا لفظ ہمارے معاشرے میں زیادہ مستعمل ہے۔

کچھ یہی حال ایزد و یزدان الفاظ کا بھی ہے۔ اوستائی زبان میں جس لفظ کا تلفظ یزتا ہے وہ پہلوی زبان میں ایزد ہوگیا ہے، جو اسی شکل میں فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ فارسی اور اردو میں یہ لفظ خالق اور اللہ کے لیے بولا جاتا ہے مگر یہ جس زبان کا لفظ ہے اس میں اس کے معنی بالکل ہی دوسرے ہیں، اوستائی زبان میں یزتا کا لفظ اہورا مزدا کی ایک ایسی مخلوق کے لیے استعمال ہوا ہے جس کا کام بالکل فرشتوں جیسا ہے اور اس مخلوق کی تعداد ہزاروں سے بھی متجاوز ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اہورا مزدا کی مخلوقات میں ایک مخلوق ایسی بھی ہے جو یزتا یا ایزد سے بلند اور اعلا مرتبہ پر فائز ہے اور اس کی تعداد اوستا کے مطابق صرف سات ہے۔ یہ کہنا تو دشوار ہے کہ کس طرح ایرانی اور وسط ایشیائی مسلمانوں نے ایک ایسی مخلوق کے نام کو خدائے واحد کے نام کے طور پر استعمال کرنا شروع کیا جس کی تعداد ہزاروں سے زیادہ ہے، بہرحال یہ حقیقت ہے کہ ایزد کا لفظ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں خدائے واحد کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ جہاں تک لفظ یزدان کا تعلق ہے یہ لفظ ایزد کی جمع کے طور پر پہلوی زبان میں مستعمل تھا اور اس کا اصل تلفظ ایزدان تھا۔ اس جمع کے علاوہ دو لفظ اور بھی تھے جو لفظ ایزد کی جمع کے طور پر استعمال ہوتے تھے، ہماری مراد یزتان اور یزدان سے ہے۔ یزدان کا لفظ فارسی میں برقرار رہا اور ایرانی اور وسط ایشیائی مسلمانوں کے اثر سے ہندوستان کے اسلامی معاشرے سے بھی اس کو قبولیت کی سند ملی۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ یزدان کا لفظ اپنی شکل کے اعتبار سے تو جمع ہے مگر معنی کے لحاظ سے اس کا شمار واحد الفاظ میں ہوتا ہے۔ ایزد اور یزدان، یہ دونوں الفاظ ہماری زبان اور معاشرہ میں اس طرح رچ بس گئے ہیں کہ ان کے غیر اسلامی اور غیر ملکی ہونے کا احساس تک نہیں ہو پاتا۔

اسی طرح فرشتہ کا لفظ فارسی اور اردو زبانوں میں 'مَلک' کے لفظ کے مترادف کے طور پر استعمال ہوتا رہا ہے اور آج بھی مستعمل ہے۔ یہ لفظ اپنی اصل کے لحاظ سے ایک قدیم ایرانی لفظ ہے، جس کا اوستائی تلفظ फराएशता ہے اور فارسی باستان میں फराइशता۔ اوستا اور فارسی باستان میں اس لفظ کے معنی صرف فرستادہ کے ہیں۔ یہ بات تحقیق طلب ہے کہ کب اور کیوں کر مَلک کو ایرانی اور وسط ایشیائی مسلمانوں نے فرشتہ کہنا شروع کیا؟ ایک قیاسی وجہ اس کی یہ ہوسکتی ہے کہ مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق حضرت جبرئیل علیہ السلام باری تعالیٰ کا کلام لے کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لاتے تھے، چوں کہ وہ فرستادۂ خدا تھے اس لیے ممکن ہے کہ اوّل اوّل ان کو فرشتہ کے لقب

سے ملقب کیا گیا ہو اور وقت و زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ اس لفظ میں اتنی وسعت پیدا کرلی گئی کہ اس کا اطلاق ملائکہ کے پورے طبقے پر کیا جانے لگا۔ بہرحال یہ امر تحقیق طلب ہے اور اس سلسلے میں کوئی حتمی بات نہیں کی جاسکتی۔ فرشتہ کا لفظ ہندوستان کے اسلامی معاشرے میں کچھ اس طرح جذب ہوگیا ہے کہ اس کی اصل وکنہ کی طرف ہمارا دماغ کبھی متوجہ ہی نہیں ہوتا اور ہم اس کو ایک ''اسلامی'' لفظ سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ اس لفظ کے اصل اور سیدھے سادے معنی فرستادہ کے ہیں۔

اب آیئے نماز اور روزہ کی طرف۔ فارسی اور اردو میں عربی لفظ صلوٰۃ کے مترادف کے طور پر نماز کا لفظ بولا جاتا ہے۔ ہندوستان میں تو صلوٰۃ کا لفظ استعمال کرنے والے معدودے چند ہی ہوں گے۔ نماز کا لفظ پاژند کے لفظ نماژ کی یاد دلاتا ہے اور گمان غالب یہی ہے کہ یہ لفظ براہ راست پاژند سے اخذ کیا گیا ہے اور ''ژ'' کو ''ز'' سے بدل دیا گیا ہے۔ اوستائی زبان میں اس کی دو شکلیں ملتی ہیں کہیں کہیں پر اس کو ''نمہ'' کہا گیا ہے، جس میں دعا کا مفہوم غالب ہے اور کہیں کہیں پر نمہ کی جگہ نمس کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہی لفظ جب پہلوی زبان میں استعمال ہوتا ہے تو اس کا تلفظ نِج ہوتا ہے۔ مسلمانوں میں نماز کا جو طریقہ رائج ہے زردشتیوں کے یہاں اس طرح کی کوئی بات نہیں تھی۔ اس کی جگہ ان کے یہاں آتش کدوں میں دعا خوانی ہوتی تھی۔ اس لیے یہ سمجھنا دشوار ہے کہ ایرانی اور وسطِ ایشیائی مسلمانوں نے اپنی صلوٰۃ کو نماز کا نام کیوں دیا۔ ممکن ہے کہ اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ چوں کہ صلوٰۃ کا اختتام دعا پر ہوتا ہے اس لیے انھوں نے صلوٰۃ ہی کو اس نام سے موسوم کرنا شروع کردیا ہو جس کو ان کے آباواجداد دعا کے معنوں میں بولتے تھے۔ وہ یہی لفظ لے کر ہندوستان آئے اور ان ہی کے زیراثر ہندوستان میں بھی صلوٰۃ کی جگہ پر نماز کا لفظ اس طرح رائج ہوگیا کہ اب اگر ہم نماز کا لفظ ترک کرکے صلوٰۃ کا لفظ رائج بھی کرنا چاہیں تو عوام کو اس لفظ کے ترک کرنے میں بہت تکلف ہوگا۔

یہی حال روزہ کے لفظ کا بھی ہے۔ اس لفظ کی کوئی نہ کوئی شکل اوستا، فارسی باستان اور پہلوی تینوں زبانوں میں ملتی ہے۔ اس لفظ کی اوستائی شکل رَاُچاہ रओचाह ہے جو فارسی باستان میں رَاُوچاہ اور پہلوی میں رودچ ہوگئی۔ جہاں تک اس لفظ کے معنی کا تعلق ہے اوستا میں اس کے معنی روشنی کے ہیں اور فارسی باستان اور پہلوی میں دن کے۔ اوستا فارسی باستان اور پہلوی تینوں زبانوں میں اس لفظ کے جو معنی ہیں اس کا کوئی تعلق کسی مذہبی عمل سے نہیں ہے۔ نہ جانے کس طرح اور کیوں وسطِ ایشیائی اور ایرانی مسلمانوں نے اس لفظ کو صوم کا مترادف قرار دے لیا۔ ممکن ہے کہ اس لفظ کو صوم کے معنی میں استعمال کرنے کی وجہ یہ ہو کہ روزہ کی ابتدا روشنی کے پھوٹنے سے پہلے پہلے ہی ہوجاتی ہے اور اس کا خاتمہ روشنی کے ختم ہونے پر ہوتا ہے۔ چوں کہ روزہ کی ابتدا اور خاتمہ دونوں ہی کا تعلق کسی نہ کسی شکل میں روشنی سے ہے اس لیے ایرانی اور وسط ایشیائی مسلمانوں نے صوم کے لفظی معنی کو ظاہر کرنے کے لیے روزہ کا لفظ منتخب کرلیا ہو جس میں دن کے بھی معنی مضمر ہیں اور روشنی کے بھی۔ بہرحال اتنی بات تو مسلم ہے کہ روزہ کا لفظ خالص ایرانی لفظ ہے جو وسط ایشیائی اور ایرانی مسلمانوں کے ہمراہ ہندوستان آیا اور یہاں کے معاشرہ اور زبان میں جذب ہوکر رہ گیا۔

ابھی تک ہم نے جن الفاظ کا مطالعہ پیش کیا ہے وہ یہ الفاظ ہیں جو نہ تو عربی ہیں اور نہ اسلامی۔ لیکن ہندوستانی مسلمانوں نے ان قدیم ایرانی اور زردشتی الفاظ کو اس طرح اپنی مذہبی لغت کا جز بنالیا ہے کہ اب ان الفاظ کو ترک کرنا دشوار ہی نہیں ایک حد تک ناممکن بھی ہے۔ اس طرح کے اور بھی بہت سے دوسرے الفاظ پیش کیے جاسکتے ہیں جو ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی اصطلاح بن گئے ہیں اور ان الفاظ کا سہارا لیے بغیر کوئی بھی ہندوستانی مسلمان اپنے مذہبی خیالات کا اظہار نہیں کرسکتا۔ اس طرح کے الفاظ میں بہشت، دوزخ، سروش، رستخیز یا رستاخیز وغیرہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ہم مذکورہ الفاظ سے صرف نظر کرتے ہوئے اس مطالعے کے دوسرے حصے کی طرف آتے ہیں۔

ایرانی اور وسط ایشیائی مسلمان جب ہندوستان آئے تو اس زمانے میں ایران میں شہنشاہیت کو قائم ہوئے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اس مدت میں جن خاندانوں نے ایران پر حکمرانی کی ان کو ہم بہ آسانی دو حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ پہلے حصے میں تو ایران کے وہ شاہی خاندان آتے ہیں جن کا کوئی تاریخی ریکارڈ دنیا میں باقی نہیں ہے۔ ان کے بارے میں ہماری جو بھی معلومات ہیں وہ سینہ بہ سینہ چلی آنے والی ان افسانوی روایات پر مشتمل ہیں جن میں بیشتر کا تذکرہ پہلوی زبان کے شاہ ناموں اور پھر فردوسی کے شاہ نامے میں موجود ہے۔ دوسرا حصہ ان شاہی خاندانوں پر مشتمل ہے جن کے بارے میں یونانی اور عرب مورخین کی شہادتیں دستبرد زمانہ سے محفوظ رہ گئی ہیں، اس کے علاوہ خود ان کے زمانے کے بہت سے ایسے کتبے مکشوف ہوگئے ہیں جن کی مدد سے ان خاندانوں سے متعلق بادشاہوں کی شخصیت اور عہد کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ ہم نے اوپر کی سطور میں جن بادشاہوں کا تذکرہ کیا ہے ان کے نام اور کارنامے ایرانی اور وسط ایشیائی باشندوں کے اجتماعی لاشعور کا ایک حصہ بن چکے تھے۔ قبولِ اسلام کے بعد بھی ان ایرانی اور وسط ایشیائی مسلمانوں نے اپنے اس تہذیبی ورثے اور اجتماعی

لاشعور کی اس طرح آبیاری کی کہ وہ ان کو اپنے ہمراہ ہندوستان لائے اور ہندوستان لاکر انھوں نے ان افراد کو ہندوستانی زبانوں سے اس طرح روشناس کرایا کہ وہ ان کا ایک ناقابلِ تقسیم جز بن گئے۔ صرف اردو ہی میں نہیں بلکہ فارسی سے متاثر ہونے والی دوسری زبانوں میں بھی گیومرث، ہوشنگ، ضحاک، فریدون، ایرج، تور، گرشاسپ، تہماسپ، کیقباد، کیکاؤس، سیاوش، افراسیاب، لہراسپ، بہمن، داراب، دارا، اسکندر، اردشیر اور خسرو پرویز جیسے بادشاہوں کے نام اور کارنامے اس طرح بیان ہوئے ہیں گویا یہ شخصیتیں غیر ملکی نہیں بلکہ ہندوستانی ہیں۔ ان بادشاہوں کے علاوہ جواں مردوں، پہلوانوں، ہیروؤں میں سے اردو کے علاوہ دوسری اور زبانوں میں بھی، رستم، سہراب، ژال، روداب، سام، برزو گیو اور گودرز کے قصے اسی طرح مشہور ہیں جس طرح ہندوستانی نبرد آزماؤں کے قصے۔ عشق و عاشقی کے میدان میں دیکھیے تو شیرین و فرہاد، بیژن و منیژہ کے قصے ہندوستان میں اسی دلچسپی سے پڑھے اور سنے جاتے ہیں جس دلچسپی سے لوگ ہیر رانجھا اور سسی پنوں کے قصوں کو سنتے ہیں۔ ہندوستان آنے والے وسط ایشیائی اور ایرانی مسلمانوں نے ہندوستان کی زبانوں کو زردشت، اوستا، ژند، پاژند، مانی، مزدک، آتش کدہ، مغ اور موبد سے صرف آشنا ہی نہیں کیا بلکہ ان کے بارے میں معلومات کا وہ خزینہ بھی دیا جو ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کا گراں مایہ حصہ ہے۔

قدیم ایرانی اور زردشتی الفاظ، افکار و افراد کا یہ مختصر ترین جائزہ اس بات کو ثابت کرنے کے لیے بہت کافی ہے کہ ہندوستان آنے والے مسلمان اپنے ساتھ صرف مذہب اسلام اور اسلامی تصورات ہی نہیں لائے بلکہ قدیم ایرانی اور زردشتی تہذیبی ورثہ بھی اپنے ہمراہ لائے جو وقت اور زمانے کے گزرنے کے ساتھ ہندوستان کے تہذیبی ورثہ کا ایک ناقابلِ تقسیم جز بن گیا۔

□□□

کلیاتِ ولی

مرتب: نورالحسن ہاشمی

اردو شاعری کو ایک سمت عطا کرنے والے شیخ محمد ولی (ولی دکنی) سے اردو دنیا بہ خوبی واقف ہے لیکن ان کی کلیات کی مختلف اشاعتوں کے باوجود کلام کی عدم دستیابی اہلِ ذوق کو کھلتی رہی ہے۔ پروفیسر نورالحسن ہاشمی کی ترتیب و تدوین یہ کلیات پہلی بار 1989 میں اتر پردیش اردو اکادمی سے شائع ہوئی تھی لیکن اس نسخے کی بھی عدم دستیابی کے سبب اکادمی کے اشتراک سے قومی اردو کونسل نے بہ نظرِ ثانی پروفیسر نثار احمد فاروقی (مرحوم) و بعد ازاں بہ نظرِ ثالث پروفیسر لئیق صلاح، حال ہی میں شائع کی ہے۔ اس کلیات کے متن کی تصحیح میں ہند و پاک کی تمام دستیاب اہم مطبوعات و مخطوطات سے استفادہ کیا گیا ہے جس کی وضاحت پروفیسر ہاشمی نے اپنے ''دیباچہ''، ''مقدمے'' اور پروفیسر لئیق صلاح نے ''حرفے چند'' میں کیا ہے۔ ولی کی شاعری کی زبان سے متعلق ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کا تجزیہ بھی کلیات میں شامل ہے اور ولی کے کلام کے بعد اس کی فرہنگ بھی دی گئی ہے۔

صفحات: 433، قیمت -/148 روپے

اتحاد سے انتشار کی طرف

مصنف: پروفیسر مشیر الحسن

اودھ کی گم ہوتی ہوئی قصباتی تہذیب اس ہند ایرانی ثقافتی ورثے کی امین رہی ہے جو ہمارے صدیوں کے ثقافتی میل جول کی دین تھا۔ پروفیسر مشیر الحسن کی یہ کتاب جو ایک مورخ کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے مختلف مذہبی فرقوں کے ان باہمی تعلقات پر روشنی ڈالتی ہے جو کثرت میں وحدت کی آئینہ داری کرتے تھے۔ قصبات کی روز مرّہ کی زندگی رسم و رواج، سماجی اور مذہبی تقریبات، ان سب چیزوں کا ایسا دانشورانہ بیان جو دلچسپ بھی ہے اور خیال انگیز بھی۔

صفحات: 415، قیمت: -/216 روپے

اردو خبرنامہ

اردو کے فروغ کے لیے حکومت ہر قدم اٹھانے کو تیار

● نئی دہلی۔ 20 فروری، ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں تمام مذاہب کو ماننے اور مختلف زبانیں بولنے والے مل جل کر ملک کی تقدیر بناتے ہیں۔ اردو زبان نے ملک کی آزادی کی تحریک میں جو کردار کیا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اردو کی بقا اور اس کے فروغ کے لیے جو بھی ضروری ہوگا حکومت کرنے کو تیار ہے۔ ان خیالات کا اظہار آج مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل ارجن سنگھ نے ڈپٹی اسپیکر ہال کانسٹی ٹیوشن کلب میں روزنامہ جدید خبر کے انٹرنیٹ ایڈیشن کے اجرا کے موقع پر ''قومی تعمیر میں اردو صحافت کا حصہ'' کے موضوع پر منعقدہ سیمینار میں خطاب کرتے ہوئے کیا۔ مرکزی وزیر برائے آبی وسائل پروفیسر سیف الدین سوز نے روزنامہ جدید خبر کے انٹرنیٹ ایڈیشن کا اجرا کیا۔ ارجن سنگھ نے کہا کہ جب انھوں نے مولانا آزاد یونیورسٹی کے قیام کی تجویز پیش کی تھی تب اس وقت کے وزیر اعظم نے ان سے کہا تھا کہ یہ کون سا نیا شگوفہ ہے تو میں نے کہا تھا کہ جب تک اردو کو اس کا حق نہیں دیا جائے ملک ترقی نہیں کرسکتا۔

پروفیسر سیف الدین سوز نے کہا کہ اردو کے مستقبل سے وہ قطعی مایوس نہیں ہیں۔ اردو میں اپنی ایک داخلی قوت ہے یہی وجہ ہے کہ تمام مخالف حالات کے باوجود آج 20 کروڑ سے زیادہ لوگ اردو پڑھتے، لکھتے اور بولتے ہیں۔ اردو صحافت کے رول کے بارے میں انھوں نے کہا کہ جنگ آزادی کے دوران ہی نہیں بلکہ آزادی کے بعد بھی اردو صحافت نے ہمیشہ سنجیدہ کردار ادا کرتے ہوئے قومی تعمیر میں تعاون کیا ہے۔ راجیہ سبھا کے رکن محمد ادیب نے کہا کہ کئی بار اردو اخبارات کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جاتا ہے اور انھیں ان کا حق نہیں مل پاتا۔ اردو اخبارات کو ڈی اے وی پی کے اشتہارات کا کم سے کم 10 فی صد حصہ ملنا چاہیے۔ فلم فیسٹیول کے ڈی آئی جی ایس ایم خان نے کہا کہ یہ تشویش کی بات ہے کہ اردو پبلیکیشنز کی تعداد میں کمی آرہی ہے۔ انھوں نے اردو والوں سے اپیل کی کہ انھیں اردو اخبارات خریدنے چاہئیں۔

معروف اردو صحافی اور ممبر پارلیمنٹ احمد سعید ملیح آبادی نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے اردو صحافت کی تاریخ پر روشنی ڈالی اور اردو اخبارات کے مسائل سے بھی روشناس کرایا۔ انھوں نے حکومت سے پریس کمیشن قائم کرنے کا مطالبہ کیا۔ اس موقع پر روزنامہ جدید خبر کے ایڈیٹر معصوم مرادآبادی نے تمام مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔ پروفیسر اختر الواسع، فرحت احساس، قاسم رسول الیاس، ظفر نقوی اور قربان علی وغیرہ نے بھی اظہار خیال کیا۔ آل انڈیا کانگریس کے شعبۂ اقلیت کے چیئرمین عمران قدوائی نے مہمان ذی وقار کے طور پر شرکت کی۔ دیگر اہم شرکا میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے وائس چیئرمین چندر بھان خیال، دہلی اسٹیٹ اقلیتی کمیشن کے چیئرمین کمال فاروقی، جمعیۃ علما کے سکریٹری مولانا عبدالحمید نعمانی، متین امروہوی، طارق امین اور الیاس ملک وغیرہ شامل تھے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

رائے کا اظہار ضروری ہے

● نئی دہلی۔ 20 فروری، سماجی علوم کے محقق کے طور پر ہمارا کام صرف رائے قائم کرنا نہیں بلکہ رائے کا اظہار بھی ضروری ہے، اور ضرورت پڑنے پر عملی اقدام سے بھی گریز نہیں کرنا چاہیے۔ ان خیالات کا اظہار وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر مشیر الحسن نے ''دیار میر تقی میر'' میں شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے ریسرچ اسکالرس کی ایسوسی ایشن ''بزم تحقیق'' کا افتتاح کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ کسی بھی ادارے کی ترقی اس کی عمارتوں سے نہیں ہوتی۔ اس کی اصل شناخت ریسرچ اور کتابیں ہوتی ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ پچھلے کچھ سالوں کے دوران جامعہ کی فضا بدلی ہے اور اس بات کی امید ہے کہ آنے والے دنوں میں جامعہ کے اندر تحقیق و تجزیہ کی روایت مزید آگے بڑھے گی۔ اس موقع پر صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز پروفیسر اختر الواسع نے اپنے صدارتی کلمات میں ''بزم تحقیق'' کے قیام کی اس پہل کو مستحسن قرار دیتے ہوئے کہا کہ اس سے شعبے کی تحقیقی سرگرمیوں کو جلا ملے گی۔ انھوں نے کہا کہ محقق نہ وکیل استغاثہ ہوتا ہے اور نہ وکیل دفاع بلکہ اس کا کام حقائق کو پیش کرنا ہوتا ہے۔ بزم تحقیق کے نگراں ڈاکٹر اقتدار محمد خاں نے مہمان خصوصی کا استقبال کیا۔ بزم تحقیق کے نائب صدر شکیل احمد نے ایسوسی ایشن کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ شعبے سے وابستہ تقریباً 40 ریسرچ اسکالرس نے اس کے قیام کا فیصلہ اس لیے کیا کہ باہمی اشتراک و تعاون کے ذریعے شعبے کے اندر تحقیقی سرگرمیوں کو تیز کیا جائے اور تحقیق کے معیار کو بلند کیا جائے۔ بزم تحقیق کے جنرل سکریٹری نسیم گل نے ایسوسی ایشن کے اغراض و مقاصد بیان کرتے ہوئے مستقبل کا منصوبہ پیش کیا۔ پروگرام کا

آغاز نجم السحر ثاقب کی تلاوت کلام پاک سے ہوا جبکہ ترجمہ صدف بی نے پیش کیا اور آخر میں جوہی گپتا نے کلمات تشکر ادا کیے۔ اس پروگرام میں شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے ریسرچ اسکالرس کے علاوہ شرکا میں پروفیسر ذکرالرحمٰن، ڈاکٹر رضی احمد کمال، ڈاکٹر محمد اسحاق، ڈاکٹر فرید خانم، ڈاکٹر سید شاہد علی، ڈاکٹر عمران عندلیب، ڈاکٹر محمد ارشد، ڈاکٹر محمد خالد خاں، ڈاکٹر عمر فاروق، ڈاکٹر نجم السحر ثاقب، ڈاکٹر مفتی محمد مشتاق، ڈاکٹر صہیب عالم وغیرہ کے نام ہیں۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

غالب سیکولر اور یونیورسل شاعر

● نئی دہلی۔ 15 فروری، انجمن ترقی اردو (دہلی) کے زیر اہتمام اور غالب انسٹی ٹیوٹ انجمن ترقی اردو (ہند)، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور اردو اکادمی کے تعاون سے نظام الدین میں مزار غالب کے نزدیک ''یوم غالب'' کے عنوان پر ایک جلسے کا اہتمام کیا گیا جس میں معروف ہندی صحافی وشنو کھرے، ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، شاہد ماہلی، پروفیسر شمیم حنفی، ڈاکٹر عقیل احمد، پروفیسر علی احمد فاطمی، ڈاکٹر کمال احمد صدیقی، گلزار دہلوی وغیرہ نے شرکت کی۔ قبل ازیں غالب کے مزار پر گل پوشی بھی کی گئی۔ صدارتی کلمات میں پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ غالب کا مطالعہ خود اپنی دریافت کا ایک سفر ہے۔ مہمان خصوصی وشنو کھرے نے کہا کہ غالب سے محبت جتنی اردو والوں کو ہے، اس سے کم ہندی والوں میں نہیں ہے۔ غالب سیکولر اور یونیورسل شاعر ہیں۔ انجمن ترقی اردو ہند کے سکریٹری خلیق انجم نے کہا کہ ہندی اور اردو کے مابین دیواریں کھڑی کر دی گئی ہیں لیکن وشنو کھرے جیسا رویہ اور اخلاق رہا تو یقیناً یہ دیواریں عنقریب منہدم ہو جائیں گی۔ پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ اردو شاعری کی پوری تاریخ میں ہم جتنے بے تکلف غالب سے ہیں، شاید کسی دوسرے سے نہیں۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے کہا کہ غالب بہت مشکل شاعر ہے۔ غالب اکیڈمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے عہد غالب سے متعلق خواجہ حسن نظامی کی بارہ کتابوں پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ان کتابوں میں عہد غالب خصوصاً 1857 کے آس پاس کے واقعات و حادثات کی جو تصویر کشی کی گئی ہے، وہ کہیں اور نہیں ملتی۔ شاہد ماہلی نے کہا کہ سرکار سے کئی بار درخواست کی گئی کہ غالب کے نام پر ہوائی اڈہ کا نام نہیں تو کم ازکم شاہراہ یا میٹرو اسٹیشن کا نام رکھا جائے لیکن اب تک ایسا کچھ نہیں ہوا۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

جگر مرادآبادی پر ایک روزہ سیمینار

● مرادآباد۔ 24 فروری، شہنشاہ غزل جگر مرادآبادی کی شخصیت اور ادبی خدمات پر اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ کے زیر اہتمام یہاں ایک روزہ سیمینار بمقام انصار انٹر کالج منعقد ہوا۔ کنوینر ڈاکٹر مجاہد فراز تھے اور صدارت معروف شاعر منصور عثمانی نے کی۔ مہمان خصوصی معصوم مرادآبادی اور مہمان اعزازی معصوم نہٹوری شری نواس اپادھیائے، ڈاکٹر وشیش کمار گپتا تھے۔ ڈاکٹر صابر سنبھلی، ڈاکٹر شعائر اللہ خاں، ڈاکٹر اظہار معصوم خاں (رامپور) ڈاکٹر منور احمد صدیقی، ڈاکٹر اظہر معصوم خاں (رامپور) ڈاکٹر منور احمد صدیقی، ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی (امروہہ) ڈاکٹر زین العابدین (چاند پور) ڈاکٹر معراج الحسن سہوانی، ڈاکٹر مینا نقوی، عبدالحمید شمسی، ڈاکٹر محمد آصف حسین، ڈاکٹر مجاہد فراز نے اپنے مقالے پڑھے۔ پروگرام میں ڈاکٹر عارف حسن خاں کو ادبی تحقیق و تدریس، محمد عتیق کو خدمت اردو زبان، منصور عثمانی کو نظامت، معصوم نہٹوری کو ادبی خدمات، معصوم مرادآبادی کو صحافت، حبیب اختر قادری کو صحافت، عبدالحمید شمسی کو لائبریری کے قیام، سید محمد ہاشم کو الیکٹرانک میڈیا، قمر قدیر ارم کو افسانوی ادب اور ڈاکٹر محمد آصف حسین کو تحقیق، تنقید و ادب کے لیے ایوارڈ سے نوازا گیا۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

فراق گورکھپوری پر دو روزہ سیمینار

● اُجین۔ آج کے مشکل وقت میں سچائی اور انسانیت کی تلاش بہت مشکل عمل ہے۔ شاعری اسی کی تلاش کا نام ہے۔ فراق گورکھپوری نے ہماری تہذیب اور ثقافت کی تاریخ میں اپنی شاعری اور عمل سے ایک سنہری ورق جوڑ دیا ہے۔ ہندوستان کی ادبی تاریخ انھیں فراموش نہیں کر سکتی۔ یہ الفاظ اُجین کے ممبر پارلیمنٹ ڈاکٹر ستیہ نارائن جاٹیہ نے اُجین کے مادھو کالج کے گاندھی ہال میں ''جدید اردو شاعری اور فراق گورکھپوری'' موضوع پر منعقد دو روزہ قومی سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے کہے۔ 21 اور 22 فروری 2009 کو تاریخی عظمت کے حامل شہر اُجین میں یو جی سی کے تعاون سے منعقد سیمینار کی افتتاحی تقریب کی صدارت وکرم یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر شیو پال سنگھ اہلاوت نے کی۔

کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر صادق (دہلی) نے کہا کہ غزل کی جس روایت کو امیر خسرو، میر اور غالب نے جلا بخشی اس کو فراق کا نام لیے بغیر مکمل نہیں مانا جائے گا۔ پروفیسر آفاق احمد (بھوپال) نے کہا کہ فراق کی غزلوں کی پہچان ان کے منفرد لب و لہجے کی وجہ سے ہے۔ استقبالیہ پرنسپل

ڈاکٹر ایل این ورما نے پیش کیا۔ مہمان اعزازی جناب دیوندر اسر (دہلی) تھے۔ افتتاحی تقریب کے آغاز میں گلوکارہ چترا پنڈت نے محمود ذکی کا لکھا ہوا اُجین کا ترانہ پیش کیا۔

یہ سیمینار چار سیشن پر مشتمل تھا جن کے صدور جناب دیوندر اسر (دہلی)، جناب چندر بھان خیال (وائس چیئرمین قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی)، ڈاکٹر صاحب علی صار (صدر شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی)، جناب شاہد ماہلی (ڈائرکٹر غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی)، ڈاکٹر محمد شفیع (برہان پور) تھے۔ نظامت کی ذمے داری پروفیسر واجد قریشی، ڈاکٹر غلام حسین اور ڈاکٹر حدیث انصاری نے ادا کی۔ سیمینار کے شرکا میں ڈاکٹر شاہینہ تبسم (دہلی)، ڈاکٹر انور ظہیر انصاری (بڑودہ)، ڈاکٹر امین انعام دار (امراوتی)، ڈاکٹر صاحب علی (ممبئی)، ڈاکٹر محمد شفیع (برہان پور)، ڈاکٹر منظور احمد (گلبرگہ)، ڈاکٹر اشفاق عارف (جبلپور)، ڈاکٹر بلقیس جہاں (بھوپال)، ڈاکٹر عزیز اندوری (اندور)، ڈاکٹر حدیث انصاری (اندور)، ڈاکٹر عثمان انصاری (برہان پور)، ڈاکٹر ارون ورما (اُجین)، ڈاکٹر غضنفر اقبال (گلبرگہ)، جناب شمس الدین حکیم (گلبرگہ)، ڈاکٹر فرزانہ غزال (بھوپال)، ڈاکٹر رام سنگھ یادو (اُجین)، ڈاکٹر ثمینہ سعیدی (بھوپال)، ڈاکٹر صادق (بھوپال)، ڈاکٹر سید عابد علی (گوالیار)، ڈاکٹر نصرت سلطان (اُجین)، محترمہ صادقہ خان (دھار)، ڈاکٹر روبینہ عرشی (جاورہ)، جناب آفاق رحمانی (شاجاپور)، ڈاکٹر صبا عظیم (بھوپال) تھے۔

اختتامی اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے جناب چندر بھان خیال نے کہا کہ اس دو روزہ سیمینار میں فراق کی شخصیت اور تخلیقات کے مختلف گوشوں کو مقالہ نگار حضرات نے اپنے مقالوں میں بہ خوبی اجاگر کیا ہے۔ محترم دیوندر اسر نے کہا کہ فراق نے اپنی شاعری میں لمحوں اور وقت کو پکڑنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اپنے زمانے کو پکڑنا بڑا مشکل کام ہوتا ہے یہ کام بڑا تخلیق کار ہی کرسکتا ہے۔ جناب شاہد ماہلی نے کہا کہ فراق کی شاعری میں ہندوستانی تہذیب اور ثقافت کی بڑی دلکش ترجمانی ہوئی ہے۔ اختتامی اجلاس میں گلوکارہ ڈاکٹر ارچنا پرمار اور ڈاکٹر پرکاش کڑوتیہ نے فراق کی غزلوں کو موسیقی کے ساتھ پیش کیا۔ سیمینار کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ظفر محمود نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر غلام حسین نے حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا اور یو جی سی کے مالی تعاون پر اظہار ممنونیت کیا۔ (ڈاک سے)

ساحر لدھیانوی اور کیفی اعظمی کے نام ایک شام

● بھیونڈی کے معروف تعلیمی، ثقافتی اور سماجی ادارے ''سہارا سوشل گروپ'' کے زیر اہتمام 15 فروری کو ایک ثقافتی پروگرام کا انعقاد ہوا۔ پروگرام میں سنہرے دور کے فلمی گیت کاروں ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی، شکیل بدایونی اور مجروح سلطان پوری کے لکھے، دلوں کو چھو لینے اور دماغوں میں ہلچل پیدا کردینے والے گیت، موسیقی کی دھنوں پر شری یٰسین سید نے پیش کیے۔ میرا روڈ، ڈومبیولی، پونے، شولاپور اور بیجاپور (کرناٹک) کے گلوکاروں اور سنگیت کاروں نے بھی اپنے اپنے فن کا جادو جگایا اور سامعین سے خوب داد وصول کی۔

یہ کامیاب پروگرام شب ایک بج کر 15 منٹ تک چلتا رہا۔ جس میں بھیونڈی شہر اور آس پاس کے سیکڑوں سامعین اور باذوق حضرات پروگرام کے آخر تک موجود رہے۔ اس پروگرام کا سب سے اہم پہلو یہ تھا کہ اس میں معزز گھرانوں کی پردہ نشین خواتین کثیر تعداد میں موجود تھیں۔ پروگرام کے کنوینر شری سہیل اختر انصاری نے دلوں کو چھو لینے والے دو گیت آنجہانی مہندر کپور کی آواز میں پیش کیے۔ ساحر کی نظم ''اے شریف انسانوں، جنگ ٹلتی رہے تو بہتر ہے، شمع جلتی رہے تو بہتر ہے'' اور حب الوطنی پر مبنی گیت ''یہ دیش ہے ویر جوانوں کا، البیلوں کا مستانوں کا'' پیش ہوا تو ہال میں مسلسل تالیاں بجتی رہیں۔

پروگرام کے شروع میں پروفیسر محمد رفیع انصاری نے ساحر لدھیانوی اور کیفی اعظمی کی شاعری کا مختصر تعارف پیش کیا نظامت کی ذمے داری کامریڈ عبدالجلیل انصاری اور کمرشیل اناؤنسر شیخ صلاح الدین بیاولی نے نبھائی۔ جبکہ ''گاتا جائے بنجارا'' پروگرام کی نظامت حکیم شیخ (شولاپور) نے کی آخر میں اردو کے سینئر صحافی اختر کاظمی نے سہارا سوشل گروپ کی دعوت پر تشریف لائے سبھی مہمانانِ کرام، سامعین اور فنکاروں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ نئے سال میں ایک اچھے پروگرام کی یہ شروعات ہے۔ اگر آپ لوگوں کا تعاون حاصل رہا تو سہارا سوشل گروپ کچھ اور بہتر پروگراموں کا انعقاد کرے گا۔

(ڈاک سے)

پروفیسر زینت ساجدہ پر سیمینار

● حیدرآباد۔ 3 فروری، پروفیسر زینت ساجدہ ایک حساس اور ہمہ پہلو شخصیت کی مالک تھیں۔ ان کے ادبی کارناموں کو منظر عام پر لانے اور نئی نسل کو ان سے واقف کرانے کی ضرورت ہے۔ پروفیسر زینت ساجدہ کی تخلیقات روایتی اقدار کی ترجمان ہیں۔ ان خیالات کا اظہار سیمینار بعنوان ''زینت ساجدہ: ایک یاد'' ایک اعتراف'' میں شرکا نے کیا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو نے اس سیمینار کا اہتمام کیا تھا۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت پروفیسر کے آر اقبال احمد، نے کی۔ مرحومہ کے فرزند سید سجاد شاہد نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ پروفیسر خالد سعید نے مہمانوں کا

خیر مقدم کرتے ہوئے زینت ساجدہ کی شخصیت کے حوالے سے آج کے سیمینار کو دکنی زبان وادب کی بازیافت کی کوشش قرار دیا۔ پروفیسر کے آرا اقبال احمد نے اپنی صدارتی تقریر میں پروفیسر زینت ساجدہ کی خدمات کو خراج ادا کرتے ہوئے خواہش ظاہر کی کہ آج کے سیمینار میں پیش کیے جانے والے مقالوں کو کتابی شکل دی جائے۔ جناب سجاد شاہد نے بحیثیت مہمان خصوصی اپنی جذباتی تقریر میں کہا کہ ان کی والدہ کو سب سے زیادہ اپنے شاگردوں سے دلچسپی تھی۔ انھیں اولاد سے زیادہ شاگرد عزیز تھے۔ انھوں نے انکشاف کیا کہ زینت ساجدہ نہ تو ڈاکٹر تھیں اور نہ پروفیسر تھیں بلکہ ان کے چاہنے والے انھیں ڈاکٹر یا پروفیسر کہتے تھے جس پر وہ غصے ہو جاتی تھیں۔ مرحومہ کی خواہش تھی کہ دکنی اردو، دکنی کلچر اور آرٹ پر خصوصیت کے ساتھ کام کیا جائے۔ وہ دکنی ادب کے لیے ریسرچ سنٹر کے قیام کی بھی متمنی تھیں۔ افتتاحی اجلاس کی کارروائی ڈاکٹر شمس الہدیٰ نے چلائی۔ پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر اشرف رفیع نے کی۔ انھوں نے کہا کہ استاد وہ ہوتا ہے جو شاگردوں کے دلوں میں گھر کرلے۔ ایسے استاد بہت کم ہوئے ہیں۔ زینت آپا ایک ایسی ہی استاد تھیں۔ محترمہ لکشمی دیوی راج اور پروفیسر خدیجہ بیگم اس اجلاس کی مہمانانِ خصوصی تھیں۔ محترمہ لکشمی دیوی راج نے زینت ساجدہ کو موہنی سیرت اور صورت کا مالک قرار دیا اور کہا کہ ان کا اپنا ایک مخصوص انداز تھا۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھیں۔ اس اجلاس میں مرحومہ کی بہو ڈاکٹر شگفتہ شاہین نے ''میری امی'' کے زیر عنوان انگریزی مضمون پیش کرتے ہوئے انھیں بھرپور خراج ادا کیا۔ ڈاکٹر مسرت جہاں نے ''زینت ساجدہ بحیثیت افسانہ نگار'' کے موضوع پر مقالہ پیش کیا۔ ڈاکٹر آمنہ تحسین نے نظامت کی۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر آمنہ کشور نے کی۔ محترمہ نسیمہ تراب الحسن نے زینت ساجدہ کی شخصیت کو خراج ادا کرتے ہوئے کہا کہ ان کی طبیعت میں بناوٹ اور تصنع کا شائبہ نہ تھا۔ وہ علم بانٹنے پر زور دیتی تھیں۔ انھیں عورتوں کی ناقدری کا شدید احساس تھا۔ نظم ونثر وہ دلنشین انداز میں سمجھانے کا ہنر جانتی تھیں۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود تکبر نام کو نہیں تھا۔ ڈاکٹر حبیب ضیا نے اپنے مقالے میں پروفیسر زینت ساجدہ کے ادبی کارناموں پر روشنی ڈالی اور اس سلسلے میں کلیات شاہی کی ترتیب، نوسرہار کی ترتیب وتدوین کا حوالہ دیا۔ ڈاکٹر نکہت جہاں نے ''شمع جو جلتی رہے گی'' کے موضوع پر مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر زینت ساجدہ غیروں اپنوں، چھوٹوں اور بڑوں سب کے لیے زینت آپا تھیں۔ دکنیات، افسانہ نگاری اور خاکہ نگاری پر انھوں نے کافی کام کیا۔ حکومت آندھرا پردیش نے انھیں بیسٹ ٹیچر ایوارڈ سے نوازا تھا۔ ڈاکٹر عزیز بانو، ڈاکٹر کہکشاں لطیف اور محترمہ بی بی رضا خاتون نے مقالے پڑھے۔ سیمینار کے اختتام پر پروفیسر اشرف رفیع نے اس سیمینار کی اہمیت وافادیت بیان کی۔ اس یادگار سیمینار میں اساتذہ اور طلبہ کی بڑی تعداد کے علاوہ پروفیسر انوارالدین، جناب عبدالرحیم خاں، جناب اسلم فرشوری، پروفیسر ایس اے وہاب، پروفیسر فاطمہ بیگم، پروفیسر محمد ظفرالدین، ڈاکٹر شجاعت علی، ڈاکٹر ابوالکلام، ڈاکٹر نسیم الدین فریس، ڈاکٹر محمود کاظمی، ڈاکٹر طارق مسعودی، ڈاکٹر عصمت جہاں، ڈاکٹر فرحت ڈاکٹر فہیم اختر، جناب احتشام احمد خاں اور دوسروں نے شرکت کی۔ (عابد عبدالواسع پبلک ریلیشنز آفیسر)۔

(سالار، بنگلور)

اردو مادری زبان والے بچوں پر دھیان دینے کی ضرورت

● نئی دہلی۔ 9 فروری، ذاکر حسین اسٹڈی سرکل کے زیر اہتمام انڈیا انٹر نیشنل سینٹر میں 13 واں ذاکر حسین میموریل لیکچر ''طرز تعلیم'' کے موضوع پر منعقد ہوا جس کی صدارت پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اور نظامت ڈاکٹر محمد کاظم نے کی۔ کلیدی خطبہ این سی ای آر ٹی۔ کے پروفیسر کرشن کمار نے پیش کیا۔ صدارتی خطبے میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ این سی ای آر ٹی کو نصاب سازی کرتے وقت اردو مادری زبان والے بچوں کی طرف خصوصی توجہ دینی چاہیے اور اپنی پلاننگ میں پرائمری سطح پر اردو ذریعۂ تعلیم اور سیکنڈری ،سینئر سیکنڈری سطح پر اردو مادری زبان والے بچوں کو زبان اول کے طور پر اردو پڑھنے کا موقع دیے جانے کو شامل کرنا چاہیے۔ اپنے کلیدی خطبے میں پروفیسر کرشن کمار نے کہا کہ نصاب ایک غیر متوقع قسم کی چیز ہے جو سوچ کے برخلاف اور موافق بھی ہوسکتا ہے۔ اس موقع پر سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے جج، وزارت خارجہ کے متعدد افسران، یونیورسٹیوں کے اساتذہ کی بڑی تعداد کے علاوہ پروفیسر محمد میاں، جسٹس قریشی، خورشید عالم خاں وکرم دت، زیڈ کے فیضان، وسیم احمد غازی اور انتظار نعیم وغیرہ نے شرکت کی۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اردو کو عالمی زبان کا درجہ حاصل ہے

● حیدرآباد۔ 17 فروری، حافظ شبیر احمد صدر جمعیۃ العلما ہند اے۔ پی۔ ورکن قانون ساز کونسل نے کہا کہ اردو زبان کی دنیا بھر میں عزت وتوقیر ہے۔ یہ عالمی زبان ہے۔ ریاستی حکومت نے اس زبان کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے کر دفتری سطح پر اردو زبان میں درخواستوں کے دینے کا نظم کیا ہے۔ جلسے کی صدارت محمد حیدر علی خان نے کی۔ اس موقع پر حافظ شبیر احمد، محمد واجد حسین، مولانا محمد عبدالحمید رحمانی، مولانا حافظ قاضی عبدالماجد کو تہنیت پیش کی

گئی۔ حافظ و قاری محمد ریاض احمد کی قرأت سے کارروائی کا آغاز ہوا اور حافظ احمد صدیق نے نعت شریف پڑھی۔ حافظ شبیر احمد نے سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو زبان کی ترقی و ترویج کے لیے سبھی اردو والے آگے آئیں۔ انھوں نے کہا کہ فروغ اردو کے لیے ریاستی حکومت نے بہت سے امور انجام دیے ہیں۔ شہر و اضلاع میں کلکٹر کے دفتر میں 'اردو سیل' کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ مولانا محمد عبدالحمید رحمانی نے کہا کہ ریاست میں اساتذہ کے لیے حکومت نے 52 ہزار جائیدادوں کا اعلان کیا ہے۔ ایک ہزار جائیدادوں پر تقرر کیا ہے۔ واجد حسین نے کہا کہ ریاستی اردو اکادی کی اسکیمات سے طلبہ/اسکالر، شعرا، صحافی برادری مستفید ہو رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ماں باپ کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی اولاد کو اس زبان سے واقف کروائیں۔ مولانا حافظ قاضی عبدالماجد (کرنول)، مولانا سید مجاہد پاشاہ قادری، حافظ میر احمد الدین نے بھی خطاب کیا۔ قاری واحد علی خان نے شکریہ ادا کیا۔ (منصف، حیدرآباد)

تحقیق کے لیے موضوع کا انتخاب خود کریں

● الٰہ آباد۔29 جنوری۔ ڈی. فل. پی. ایچ. ڈی. یا کوئی تحقیقی مقالہ لکھنے کے لیے ریسرچ اسکالرز کو چاہیے کہ وہ موضوع کا انتخاب خود کریں، اساتذہ کے منتخب کردہ موضوعات پر مقالہ لکھنا اکثر غیر دلچسپ ہو جاتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر نعیم الرحمٰن فاروقی نے کیا۔ وہ شعبۂ اردو الٰہ آباد یونیورسٹی کے زیراہتمام احتشام حسین ہال میں منعقدہ یک روزہ ریسرچ اسکالرز سیمینار بعنوان ''اردو تحقیق کے مسائل'' میں بطور مہمان خصوصی اپنے تاثرات پیش کر رہے تھے۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت پروفیسر سید محمد عقیل رضوی نے کی جبکہ افتتاحی صدر شعبہ عربی و فارسی الٰہ آباد یونیورسٹی عبدالقادر جعفری نے کیا۔ اس موقع پر پروفیسر فاروقی نے افسوس کے ساتھ کہا کہ اس وقت الٰہ آباد میں جو تحقیقی کام ہو رہا ہے ہر شعبے میں وہ بہت سطحی ہو رہا ہے جسے بہتر کرنے کی ضرورت ہے۔ قبل ازیں صدر شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی پروفیسر علی احمد فاطمی نے استقبالیہ تقریر کی اور مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے سیمینار کا مقصد بیان کیا۔ انھوں نے کہا کہ موجودہ دور میں اساتذہ یا طلبہ جس غیر ذمہ داری کا ثبوت دے رہے ہیں اسے دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے ان میں بے حسی پیدا ہو گئی ہے۔ پروفیسر عقیل رضوی نے الٰہ آباد میں ریسرچ کا آغاز کیسے ہوا اور اس کی کیا اہمیت تھی اور اس وقت اس کی کیا حیثیت ہے اس پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ تحقیق میں مشکلات ہر دور میں رہی ہیں اور رہیں گی ان سے گھبرانے کی بجائے ہم محنت کریں اور اپنے اندر سے خوف نکال دیں۔ جہاں تک اساتذہ کی معلومات کا تعلق ہے تو ضروری نہیں ہے کہ ہر کوئی پوری معلومات رکھتا ہو، کرنا یہ چاہیے کہ آپ اپنے موضوع کے جاننے والوں سے ملیں۔ پروفیسر عبدالقادر جعفری نے تحقیق کے اصول پر بھرپور روشنی ڈالی۔ اس موقع پر افتتاحی اجلاس میں احسان حسن، لئیق احمد، حنا اکرام، ناصرہ خاتون رضوی اور شائستہ اقبال نے اردو تحقیق کے مسائل پر اپنے مقالات پیش کیے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت ہندی کے معروف ادیب و ناقد پروفیسر راجندر کمار نے کی۔ انھوں نے کہا کہ جو لوگ اچھا کام کر رہے ہیں ان کی قدر نہیں ہوتی جس کی وجہ سے ریسرچ اسکالروں میں مایوسی پیدا ہو رہی ہے۔ ماحول نے بھی تحقیق کے کام کو کافی متاثر کیا ہے۔ مہمان خصوصی سید محمد علی کاظمی نے کہا کہ اگر کسی زبان کا تحقیقی معیار گر رہا ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ اس کی تہذیب کمزور ہو رہی ہے اس لیے زبان کو زندہ رکھنے کے لیے تحقیق کے معیار کو برقرار رکھنے کی ضرورت ہے۔ اس موقع پر ریسرچ اسکالر شہناز ارم، حسیب الدین، عبدالندیم اور سنجے کمار نے اپنے مقالے پیش کیے۔ آخر میں ممتاز عالم ریسرچ اسکالر دہلی یونیورسٹی نے ریسرچ کے موجودہ مسائل پر گفتگو کی۔ آخر میں پڑھے گئے مقالات پر پہلا انعام حسیب الدین، دوسرا عبدالندیم اور تیسرا انعام مشترکہ طور پر لئیق احمد صدیقی اور شہناز ارم کو دیا گیا۔ حَکَم کی ذمہ داری ڈاکٹر فخر الکریم، ڈاکٹر حسنین اختر اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے انجام دی اور نتیجے کا اعلان کیا۔ نظامت کے فرائض عبدالحی اور شاہنواز عالم نے انجام دیے۔ سیمینار میں پروفیسر عبدالحامد، پروفیسر نوشابہ سردار، ڈاکٹر اشفاق حسین، ڈاکٹر شبنم حمید، ڈاکٹر عطیہ نشاط خان، ڈاکٹر عزیزہ بانو، ڈاکٹر صالحہ زرین، ڈاکٹر فاضل ہاشمی، ڈاکٹر نشاط فاطمہ کے علاوہ بڑی تعداد میں طلبہ و طالبات نے شرکت کی۔ یہ سیمینار علامہ اقبال اکادمی الٰہ آباد کے اشتراک سے منعقد کیا گیا۔

(ڈاک سے)

غالب اکیڈمی میں ایک روزہ سیمینار

● 22فروری 2009 کو غالب اکیڈی، نئی دہلی میں غالب اکیڈمی کے بانی حکیم عبدالحمید کی شخصیت پر ایک روزہ سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ حکیم عبدالحمید بیسویں صدی کی غیر معمولی شخصیت کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ انھوں نے دو درجن اداروں کے علاوہ یونیورسٹی قائم کی۔ طب کی تحقیق، اسلامیات کی تحقیق، سائنس کی تحقیق کے ادارے کھولے۔ ان کی وضع میں کبھی فرق نہیں آیا۔ اجتماعی زندگی میں فلاح کی

صورت پیدا کرنے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ دہلی میں بہت بڑے صوفیا، شعرا، علما دانشور پیدا ہوئے۔ حکیم صاحب نے غالب کی یادگار قائم کرنے کا انتخاب کیوں کیا۔ اس لیے کہ غالب میں پوری ایک روایت سمٹ آئی تھی۔ غالب متحدہ انسانیت کا خواب اور وحدت کا مفسر تھا۔ غالب کو آنے والے زمانے کی فکر تھی۔ یہی چیزیں حکیم صاحب کی فکر میں بھی شامل تھیں اس لیے حکیم صاحب نے غالب کا انتخاب کیا۔

اس سیمینار میں ڈاکٹر خالد جاوید نے غالب اور جدید فکر کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔ ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن نے غالب کی حکیمانہ دانش کے عنوان سے مقالہ پڑھے۔ ڈاکٹر دباج الدین علوی نے اپنے مقالے میں تصوف کی 700 سالہ روایت کو پیش کرتے ہوئے کہا کہ غالب صوفی نہ سہی لیکن ان کی خواہش تھی کہ دنیا میں کوئی بھی بھوکا ننگا نہ رہے۔ پروفیسر قاضی جمال حسین نے اپنے مقالے میں کہا کہ وہ اخلاقی اقدار جن کی حیثیت آفاقی ہے، کسی شاعر کے کلام کو محترم یالائق توجہ نہیں بناتیں۔ بلکہ یہ متن کی تشکیل کا وہ غیر معمولی تخلیقی فن ہے جو آنے والے زمانے میں امکان کے نئے باب وا کرتا ہے۔ پہلے اجلاس میں پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی اور خواجہ حسن ثانی نظامی نے حکیم صاحب اور غالب کی شاعری اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کیے۔ اپنی صدارتی تقریر میں پروفیسر شافع قدوائی نے کہا کہ ہر زمانے کی تنقید غالب کی طرف دیکھے گی۔ پہلے اجلاس کی نظامت پروفیسر ابن کنول نے کی۔

دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر قاضی افضال حسین نے کی۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں حکیم صاحب کی حیات سے اپنی راہیں متعین کرنی چاہیں اور انھوں نے جتنا کر دیا ہے اس سے آگے بڑھنا چاہیے۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر شافع قدوائی نے ''مابعد جدید دور میں غالب کی معنویت'' کے عنوان سے مقالہ پڑھتے ہوئے کہا کہ ادب بیانیہ فلم، موسیقی، آرٹ اور فن تعمیر سے بیک وقت وابستہ اصطلاح مابعد جدیدیت عہد حاضر کی غالباً سب سے کثیر الجہت اور متنازعہ اصطلاح ہے اور جس کی کثرت تعبیر نے اس کے متعین مفہوم کو ناقابل حصول بنا دیا ہے۔ ایسے دور میں غالب کی آزادہ روی، عدم تقلید اور کسی ایک مرکز یا وحدانی حقیقت سے مسلسل انکار تخلیقی اظہار کے نئے امکانات کو ہویدا کرتا ہے۔ پروفیسر قاضی جمال حسین نے کلام غالب میں انحراف کے بعض پہلو کے عنوان سے اپنے مقالے میں کہا کہ غالب کا کلام فکری بالیدگی کے سبب ایک ایسا آئینہ خانہ ہے جہاں ہر شعری تجربہ قاری کو انوکھی واردات معلوم ہوتا ہے۔ وہ مظاہر یا انسانی واردات کی ظاہری صورت حال پر اکتفا کرنے اور ان کو مانوس پیرایے میں بیان کرنے کے بجائے انھیں انوکھے زاویے سے دیکھتے اور نادیدہ پہلوؤں کو غیر روایتی پیرائے اظہار میں منکشف کرتے ہیں۔ اس اجلاس میں پروفیسر عبد الحق اور ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے بھی مقالے پڑھے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر نجمہ رحمانی نے انجام دیئے۔

(ڈاک سے)

شخصی اور معلوماتی ادب پر دو روزہ سیمینار

● نئی دہلی ۔ 28 فروری، جھوٹ کے بغیر خاکہ، سوانح یا سفر نامہ لکھا ہی نہیں جا سکتا۔ جہاں تک بات قارئین کی ہے، اگر تخلیق میں افسانویت ہوگی تو قاری خود بخود پیدا ہو جائیں گے۔ ان خیالات کا اظہار دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے سابق صدر پروفیسر عتیق اللہ نے آج اردو اکادمی کے زیر اہتمام ''آزادی کے بعد شخصی اور معلوماتی ادب'' کے موضوع پر منعقدہ سیمینار کے افتتاحی اجلاس کے دوران اپنی صدارتی تقریر میں کیا۔ اس اجلاس کی نظامت انیس اعظمی نے کی۔ پروفیسر عتیق اللہ نے کہا کہ سفر نامہ، خودنوشت، سوانح، انشائیہ اور خاکہ ذیلی اصناف ہیں اور یہ بھی بیانیہ کے تحت آتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ بنیادی اصناف کا ایک ادارہ قائم کرنا چاہیے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا کہ ہمارے یہاں افسانوی اور غیر افسانوی ادب کا ذخیرہ اتنا وقیع ہے کہ اس کی فہرست مرتب کریں تو ہمیں اس کی اہمیت کا اندازہ ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ کسی بھی ادیب کو تحریروں اور رجحانات میں بانٹ کر نہیں دیکھنا چاہیے۔ کناڈہ کے معروف شاعر، ادیب اور افسانہ نگار مسٹر شاہین نے کہا کہ ہر تخلیق کار بنیادی طور پر سوانح نگار ہوتا ہے۔ انھوں نے اختر حسین رائے پوری، عبادت بریلوی، اور ادا بدایونی وغیرہ کا سوانح نگار کی حیثیت سے ذکر کیا۔ اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر قمر رئیس نے خیر مقدمی کلمات میں کہا کہ آج کا موضوع بظاہر غیر ادبی معلوم ہوتا ہے لیکن یہ بہت اہم ہے۔ اس خام خیالی کو بھلا دینا چاہیے کہ خاکہ، سفر نامہ یا سوانح کی کوئی ادبی اہمیت نہیں کیونکہ آپ بیتی صرف آپ بیتی نہیں ہوتی ہے بلکہ تہذیب و ثقافت کی عکاس ہوتی ہے۔ سیمینار کا پہلا اجلاس ''انشائیہ نگاری و خاکہ نگاری کے رجحانات'' کے عنوان سے منعقد ہوا۔ جس میں مجلس صدارت کے رکن پروفیسر قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی نے کہا کہ بغیر تخلیقیت کے خاکہ، انشائیہ اور سفر نامہ نہیں لکھا جا سکتا۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے کہا کہ یہ ساری اصناف مغرب سے مستعار ہیں۔ پروفیسر شمس الحق عثمانی نے کہا کہ خاکے میں کتھا کو سمجھے بغیر ہم افسانہ نگاری کو نہیں سمجھ سکتے۔ خاکہ نگاری اور افسانہ نگاری میں بہت مماثلت ہے۔ پہلے اجلاس میں سید ضمیر حسن

دہلوی نے ''مرزا محمود بیگ کی خاکہ نگاری''، ڈاکٹر وہاج الدین علوی نے ''قرۃ العین حیدر کے سفرنامہ 'کوہ دماوند' کا تنقیدی تجزیہ''مختار ٹونکی نے '' آزادی کے بعد انشائیہ نگاری کے رجحانات''، ڈاکٹر احمد امتیاز نے ''پروفیسر رشید احمد صدیقی کی خاکہ نگاری'' اور وسیم راشد نے '' اردو خاکوں میں دہلوی تہذیب کی عکاسی'' کے عنوان سے مقالے پڑھے۔ نظامت ڈاکٹر ابوظہیر ربانی نے کی۔ دوسرے اجلاس کا موضوع ''سوانح، خودنوشت اور سفرنامے کے رجحانات'' تھا۔ اس اجلاس کی مجلس صدارت میں پروفیسر شاہد حسین، پروفیسر ابن کنول اور ڈاکٹر اعجاز علی ارشد شامل تھے جبکہ نظامت ڈاکٹر شاہد تسلیم نے کی۔ اس اجلاس میں آفتاب احمد آفاقی نے ''الیاس احمد گدی کی خودنوشت 'لکشمن ریکھا کے پار' کا تنقیدی جائزہ''، ڈاکٹر شاہد پٹھان نے ''پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کی خاکہ نگاری'' پروفیسر علی احمد فاطمی نے '' وامق جونپوری کی خودنوشت 'گفتنی ناگفتنی' کا تنقیدی تجزیہ'' اور ڈاکٹر یعقوب یاور نے ''جوش کی خودنوشت 'یادوں کی برات' کا تنقیدی جائزہ'' کے عنوان سے مقالے پیش کیے۔ آخر میں اردو اکادمی کے سکریٹری سید مرغوب حیدر عابدی نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

● نئی دہلی۔ یکم مارچ۔ تخلیقی فن کار جب اپنی سوانح لکھتا ہے تو اس کے اندر جذباتیت امنڈ آتی ہے لیکن تنقید نگار یا دانشور کے یہاں یہ بات نہیں آپاتی۔ مناظر سے لطف اندوز ہونے اور انھیں اپنے اندر جذب اپنے اندر جذب کیے بغیر ایک سفرنامہ معرض وجود میں نہیں آسکتا۔ ان خیالات کا اظہار آج اردو اکادمی دہلی کے 2 روزہ سیمینار'' آزادی کے بعد شخصی اور معلوماتی ادب'' کے آخری دن کے پہلے اجلاس میں کناڈا سے تشریف لائے اردو شاعر و ادیب ولی عالم شاہین نے اپنے صدارتی خطبے میں کیا۔ مجلس صدارت کے دوسرے رکن پروفیسر معین الدین جینا بڑے نے کہا کہ فن پاروں میں زندگی کی حقیقت کو گرفت میں لینا چاہیے۔ زندہ قومیں اعلیٰ ادب اس لیے تخلیق کرتی ہیں کہ وہ زندگی جینے کا سلیقہ رکھتی ہیں۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے کہا کہ جب تک لکھنے والا اپنی فکر اور تخیل کو پیش نہیں کرتا وہ تخلیقی فن پارہ نہیں بن سکتا۔ صرف زبان سے ادب نہیں بنتا اس میں ہم تخیل اور تصور سے جان ڈالتے ہیں تب فن پارہ وجود میں آتا ہے۔ اس اجلاس کی نظامت شعیب رضا فاطمی نے کی۔ اس موقع پر ڈاکٹر ریاض احمد نے ''کشمیر کے چند معروف ادیبوں کے سفرناموں کا تنقیدی جائزہ''، ڈاکٹر شاہینہ تبسم نے ''اس آباد خرابے میں ایک مختصر اور منفرد خودنوشت سوانح عمری'' اور ڈاکٹر صالحہ زریں نے ''ایک نقاد اور ترقی پسند دانشور کی خودنوشت ''گردِ راہ'' کے عنوان سے مقالے پیش کیے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت منظور عثمانی اور مختار ٹونکی نے مشترکہ طور پر کی جبکہ نظامت کے فرائض ممتاز عالم رضوی نے انجام دیے۔ اس اجلاس میں پروفیسر اعجاز علی ارشد نے ''اردو خودنوشت اور ثقافت''، ڈاکٹر خالد اشرف نے ''پاکستانی سفرناموں کا تنقیدی جائزہ'' اور ڈاکٹر خالد علوی نے ''برصغیر میں خودنوشتوں کے غالب رجحانات'' کے عنوانات سے مقالے پیش کیے۔ دہلی کے تمام حصوں سے متعدد شخصیات نے شرکت کی۔ دہلی کے تینوں جامعات کے طلبہ بھی بڑی تعداد میں شریک ہوئے اور بحث و مباحثہ میں حصہ لیا۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اردو اساتذہ کا تربیتی پروگرام

● اکادمی برائے فروغ استعداد اردو میڈیم اساتذہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کی جانب سے مارواڑ مسلم ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی، جودھپور، راجستھان کے اشتراک سے مولانا آزاد مسلم سینئر سیکنڈری اسکول کے کیمپس میں 17 فروری سے 22 فروری، 2009 تک ایک چھ روزہ اورینٹیشن پروگرام کا اہتمام کیا گیا۔ اس پروگرام میں 70 اردو اساتذہ نے شرکت کی۔ پروگرام کے دوران اردو زبان و ادب کے تمام پہلوؤں مثلاً اردو رسم خط، اردو املا، اردو انشا، اردو قواعد، اردو زبان، اردو ادب، اردو ترسیل و ابلاغ وغیرہ کی تدریس کے طریقۂ کار پر روشنی ڈالی گئی اور اساتذہ کو زبان و ادب کی تدریس کے نئے نئے طریقوں سے واقفیت کرائی گئی خصوصاً اس بات کی کوشش کی گئی کہ اساتذہ کے اندر اردو زبان اور ادب کی تدریس اور ان کے فروغ کے تئیں دلچسپی پیدا ہو سکے اور وہ اس کام کو کام کے بجائے خوشگوار فریضہ سمجھ کر انجام دیں۔ آزمائش و تعین قدر کے لیے مختلف مشقیں نمونے کے طور پر اساتذہ کے سامنے رکھی گئیں اور انھیں اسی انداز سے جانچ پرکھ کرنے کی تلقین کی گئی۔ دوران پروگرام اس تدریسی رہنمائی کے لیے جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی، این. سی. ای. آر. ٹی. ، دہلی اور دیگر تعلیمی اداروں کے ماہرین تعلیم کی خدمات حاصل کی گئیں۔ جن اساتذہ اور ماہرین نے اپنے تجربات و خیالات سے اساتذہ کی رہنمائی فرمائی ان میں پروفیسر خالد محمود، پروفیسر محمد نعمان خان، پروفیسر تسنیم فاطمہ، جناب شین۔ کاف۔ نظام، جناب اے۔ ڈی۔ راہی، ڈاکٹر ثروت خان اور اکادمی کے ڈائریکٹر پروفیسر غضنفر علی کے نام اہم ہیں۔

افتتاحی جلسہ 22 فروری، 2009 کو منعقد کیا گیا۔ ڈاکٹر ڈونگر سنگھ کھینچی سنڈی کیٹ ممبر جے نرائن ویاس یونیورسٹی جودھپور نے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی اور اس موقع پر فرمایا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وی. سی. مشیر الحسن صاحب اور اس اکادمی کے ڈائریکٹر غضنفر صاحب کے ہم جودھپور والے شکر

گزار ہیں کہ انھوں نے اس تربیتی پروگرام کے لیے جودھپور کا انتخاب کیا اور یہاں کے اساتذہ کے اندر اردو بیداری پیدا کی۔ کہا جا سکتا ہے کہ اردو اکادمی، جامعہ کے اس تربیتی پروگرام نے جودھپور کی ریگستانی اردو کو بھی سرسبز و شاداب کردیا۔ پروفیسر خالد محمود نے فرمایا کہ اس طرح کے پروگرام فروغ اردو کے مقاصد کی تکمیل کا مؤثر ترین ذریعہ ہیں۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے سنڈی کیٹ ممبر ڈاکٹر ایوب خان نے کہا کہ جودھپور میں اس پروگرام کا انعقاد اردو کے لیے ایک بہت ہی صحیح قدم اور نیک فال ہے۔ این. سی. ای. آر. ٹی. کے پروفیسر محمد نعمان خان نے کہا کہ جو لوگ اردو کے بڑے مراکز پر پہنچنے سے قاصر ہیں اس طرح کے پروگراموں کے ذریعے انھیں بھی تربیت کے مواقع حاصل ہو جاتے ہیں۔ اکادمی کے ڈائرکٹر پروفیسر غضنفر نے اپنے خطبے میں کہا کہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ اکادمی کے پروگراموں سے اردو اساتذہ کے اندر ایسا جوش بھر جائے کہ وہ اردو کو اپنی محبوبہ کی طرح چاہنے لگیں اور اس زبان کے لیے وہ سب کچھ کرنے لگیں جو ایک عاشق اپنے محبوب کے لیے کرتا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اس پروگرام کو کامیاب بنانے میں مارواڑ مسلم ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے اراکین جناب محمد عتیق، جناب شبیر احمد خلجی، جناب عباد اللہ قریشی، رؤف انصاری، بابو خاں شیخ وغیرہ کا اہم ہاتھ رہا ہے۔

اس موقعے پر جنرل سکریٹری محمد عتیق صاحب نے بھی اپنے خیالات کا اظہار فرمایا اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ نظامت کے فرائض مولانا آزاد مسلم ہائر سیکنڈری کے استاد بوہرا صاحب نے انجام دیے۔ (ڈاک سے)

اعزاز و اکرام

● حیدرآباد۔ 21 فروری، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد کے تیسرے کنووکیشن کے موقع پر اداکار دلیپ کمار، پروفیسر گوپی چند نارنگ، امریکہ میں ہندوستان کے سابق سفیر عابد حسین اور ناول نگار جیلانی بانو کو ان کی خدمات کے اعتراف میں ڈی لٹ (Honoris Causa) کے اعلیٰ اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔

تقریب میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنی تقریر میں کہا کہ میرا اگر کوئی استحقاق ہے تو فقط اتنا کہ میں جس زبان کا شیدا ہوں وہ برصغیر ہی نہیں، جنوبی ایشیا کی ایسی بڑی زبان ہے جو دو بڑی تہذیبوں کے تاریخی جزرومد سے پیدا ہوئی۔ جس نے صدیوں صوفیوں اور سنتوں کی آغوش میں پرورش پائی اور جو ہماری ملی جلی روحانی میراث اور ادبی روایتوں کی بہترین ترجمان ہے، جس نے گنگا و جمنا کا پانی پیا اور جو کوثر و تسنیم کے سرچشموں سے سیراب ہوئی اور جو شعریاتی و جمالیاتی ترفع اور حسن کاری و لطافت کے اعتبار سے ایسا درجہ رکھتی ہے کہ میں اردو زبان کو ''ہندوستانی زبانوں کا تاج محل'' کہا کرتا ہوں۔

تقریب کی صدارت یونیورسٹی کی چانسلر ڈاکٹر سیدہ سیدین حمید نے فرمائی جبکہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے چیئرمین پروفیسر سکھ دیو تھوراٹ نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی اور وائس چانسلر محترم پروفیسر اے ایم پٹھان مہتمم اعلیٰ تھے۔ اس موقع پر کثیر تعداد میں پروفیسر، طلبہ و طالبات، اسکالرز اور سرکردہ شخصیات موجود تھیں۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

جب وہ بولیں تو ہر اک لفظ سے خوشبو آئے
لفظ ایسے وہی بولیں جنھیں اردو آئے

● یہ تحسین تھی ظفر علی نقوی کی طرف سے ہندی اور اردو زبان کے معروف ادبا کی توقیر میں منعقد تہنیتی تقریب کے موقع پر۔ اردو کی تجدید و احیا کے لیے 15 فروری کو اتوار کی شام، یو پی ایس این اے کے ہال میں ہندی اردو ساہتیہ ایوارڈ، کمیٹی کے زیر اہتمام منعقدہ اس پروگرام کی نظامت معروف شاعر حسن کاظمی نے کی۔ پہلے مقرر اطہر نبی تھے جنھوں نے مرحوم جاں نثار اختر کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ جاں نثار اختر اگر چہ اتر پردیش کے تھے تاہم گزشتہ 35 برسوں میں ان کی یاد میں ایک جلسہ بھی منعقد نہیں ہوا۔ یہی معاملہ موسیقار نوشاد کا ہے، جن کی جائے پیدائش لکھنؤ ہے۔ انھوں نے اس شہر کو نشان امتیاز بخشا لیکن ان کی توقیر میں ایک جلسہ بھی نہیں ہوا۔ انھوں نے اعلان کیا کہ آئندہ سال سے ایک لاکھ روپئے کا ایوارڈ ہندی اور اردو زبانوں میں کسی مستحق شخص کو دیا جائے گا۔

دوسرے مقرر پروفیسر گوپی چند نارنگ تھے، جنھوں نے کیفی اعظمی، مجروح سلطان پوری، شکیل بدایونی اور جاں نثار اختر کی نشاط انگیز اور معنی خیز شاعری کے عہد زریں کو یاد کیا۔ انھوں نے جاں نثار اختر کی ایک غزل سنائی اور موجودہ دور سے اس کی تطبیق کی۔ گلزار نے اجمال و اختصار سے کام لیتے ہوئے تقریب کا اختتام کیا اور اسٹیج کو پلے ''خراشیں'' کے لیے خالی کردیا جو تہنیتی تقریب کے بعد پیش کیا گیا۔ اس موقع پر معروف ہندی اور اردو ادیبوں کو گلزار، گوپی چند نارنگ اور ظفر علی نقوی نے ایوارڈ پیش کیے۔ پروفیسر ملک زادہ منظور، ولی آدم شمیم، ڈاکٹر اچلا ناگر اور چندر بھان خیال کو پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اور ڈاکٹر اندو پرکاش ارون، سید ظفر عامر، ریحانہ قمر کو گلزار نے ایوارڈ پیش کیے۔ جبکہ شارق علی، کے کانت استھانا، ڈاکٹر حسن شنی اور راج کمار سچن کو ظفر علی نقوی کے ہاتھوں ایوارڈ ملے۔ (ہندوستان ٹائمز لکھنؤ)

● مرادآباد۔ 24 فروری، مولانا ابوالکلام آزاد کی ملی اور قومی خدمات کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ملی ایجوکیشنل فاؤنڈیشن اور کل ہند اردو تعلیمی کمیٹی کے اشتراک سے آج یہاں ''مولانا آزاد کی ملی اور قومی خدمات'' کے موضوع پر ایک سیمینار کا انعقاد کیا گیا اور اس تقریب میں اردو زبان و ثقافت کی نمایاں خدمات انجام دینے کے اعتراف میں جن اہم شخصیات کو مولانا آزاد نیشنل ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا ان میں پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن برائے طب وحکمت، قومی اردو کونسل کے نائب صدر چندر بھان خیال برائے اردو صحافت، روزنامہ راشٹریہ سہارا کے بیورو چیف اسد رضا برائے شاعری، اندرا گاندھی اوپن یونیورسٹی کے نائب شیخ الجامعہ ڈاکٹر بصیر احمد خان برائے قومی خدمات اور تعلیم، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری برائے درس وتدریس اور معروف مصور سید سرفراز زیدی، برائے مصوری شامل ہیں۔ ناگزیر وجوہ کی بنا پر پروفیسر سید ظل الرحمٰن اور جناب چندر بھان خیال کے تشریف نہ لانے پر یہ ایوارڈ ان کے نمائندوں سید سرفراز زیدی اور ڈاکٹر اختر جمال صدیقی کو دیے گئے اور ان کے پیغام پڑھ کر سنائے گئے۔ ایوارڈ بالترتیب صدر اجلاس حکیم سید معصوم علی آزاد، ڈاکٹر ایس ٹی حسن، سندیپ اگروال یوپی اردو اکیڈمی چیئر پرسن ترنم عقیل، زعفران ماجد ایڈوکیٹ اور جنت نشاں اکیڈمی کے ڈائرکٹر محمد عتیق کے ہاتھوں پیش کیے گئے۔ ضلع مرادآباد میں اردو کی نمایاں خدمات کے لیے محمد عتیق صدیقی، سید محمد ہاشم، الحاج عبدالحمید شمسی کو بھی شال اور نشان اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● ممبئی۔ گزشتہ دنوں ہفت روزہ ''اردو خبرنامہ'' ممبئی کے زیر اہتمام اردو کے معروف شاعر وصحافی جناب عبداللہ کمال کے اعزاز میں ''ایک شام عبداللہ کمال کے نام'' کرلا کے انجمن تبلیغ الاسلام اردو ہائی اسکول میں منعقد کی گئی جس میں جناب حسن کمال کے ہاتھوں انھیں مومینٹو، شال اور گلدستہ پیش کیا گیا۔ اس موقع پر شہر کے ادبا، شعرا اور ناقدین نے عبداللہ کمال کے چالیس سالہ شعری سفر کی روداد مقالوں اور تقاریر کی شکل میں پیش کی۔ جن میں صاحب اعزاز کی اہلیہ شیریں کمال، عبداللہ فیصل، خلیق الزماں نصرت، وجے اردن، نورالدین نور، سرفراز آرزو، ڈاکٹر قاسم امام، فیاض رفعت، مصطفیٰ پنجابی اور ڈاکٹر عبداللہ شامل تھے جلسے کی صدارت جناب حسن کمال نے کی جبکہ نظامت کے فرائض سید ریاض رحیم اور اقبال نیازی نے انجام دیے۔ مہمانانِ خصوصی جناب سرفراز آرزو، ڈاکٹر شیخ عبداللہ، ڈاکٹر مصطفیٰ پنجابی اور جناب فیض الحسن تھے۔ جناب حسن کمال نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ ''عبداللہ کمال کے شعری مجموعے 'بے آسماں' کو آپ چاہے جہاں سے کھولیں آپ کو ہر صفحے پر کم از کم ایک یا دو شعر اچھے مل ہی جائیں گے۔''

اس جلسے کا دوسرا حصہ شعری نشست پر مشتمل تھا جس میں حسن کمال، عبداللہ کمال، اسیر برہانپوری، سعید راہی، م.ش. نجمی، وجے اردن، سید ریاض رحیم، عبید اعظم اعظمی، منان بجنوری، شاداب صدیقی اور ڈاکٹر شیلیش وفا نے سامعین کو اپنے کلام سے محظوظ کیا۔ اخیر میں اشتیاق سعید نے تمام مہمانان، شعرائے کرام اور سامعین کے ساتھ ساتھ انجمن تبلیغ الاسلام اردو ہائی اسکول کے عہدیداران کا شکریہ ادا کیا۔

● ناگپور۔ اردو ادب اطفال کے نامور ادیب جناب وکیل نجیب کو ایک تقریب میں سابق مرکزی وزیر اور کانگریس کے سینئر لیڈر جناب سلمان خورشید کے ہاتھوں ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل نیشنل ایوارڈ تفویض کیا گیا۔ تقسیم انعام کا یہ جلسہ ریاستی حکومت کے ادارے ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل ٹرسٹ کی جانب سے ساؤتھ سینٹرل کلچرل لان میں منعقد کیا گیا تھا۔ جس کی صدارت مرکزی وزیر جناب ولاس متموار نے کی۔ یونائیڈ نیشن کے انڈر سکریٹری شری ششی تھرور نے خصوصی مہمان کی حیثیت سے شرکت کی۔ جلسے میں مہاراشٹر سرکار کے سابق وزیر شری رنجیت دیش مکھ، سابق ایم ایل سی شری گریش گاندھی، ناگپور شہر کے پولیس کمشنر شری پروین دکشت اور ایم ایل سی ایس کیور زماں صاحب بھی شریک تھے۔ آل انڈیا ہینڈلوم کارپوریشن کے رکن جناب حیدر علی دوسانی کے اہتمام میں اس جلسے کا انعقاد ہوا۔ جلسے میں وکیل نجیب کی ادبی کارگزاریوں کو سراہتے ہوئے انھیں انعام برائے فروغ اردو ادب 2009 کا یہ نیشنل ایوارڈ پیش کیا گیا۔ اس جلسے کی نظامت ظفر احمد خاں نے کی جبکہ ہدیۂ تشکر جناب جاوید انصاری نے پیش کیا۔ (ڈاک سے)

مختصرات

● بزم ادب کرشنگری کی جانب سے تمل ناڈو اسٹیٹ اردو کانفرنس 2009، کا انعقاد دیوراج محل میں 17 فروری، 2009 کو عمل میں آیا جس کا افتتاح تمل ناڈو کے گورنر عزت مآب سرجیت سنگھ برنالا نے کیا، تمل ناڈو کے قدیم چالیس اسکولوں کو انھوں نے ایوارڈ سے نوازا۔ سات اردو کتابوں علیم صبا نویدی کی نعتیہ شاعری (ڈاکٹر راحت سلطانی، حضرت قطب ویلور کی ادبی خدمات، ڈاکٹر بشیر الحق قریشی)، سیاہ و سپید (اشفاق الرحمٰن، مظہر آب تسنیم (برتر مدراسی) آغوش الطاف (قادر ظہیر) بزم نو کا ادبی سفرنامہ (حکیم یعقوب اسلم) رہبر صحت (ڈاکٹر جلیس احمد) کا اجرا گورنر صاحب کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ ایڈز کے پانچ مریضوں کو شفا یونانی ہربل کلینک، چنئی کی جانب سے مفت

دوائیں دی گئیں۔ ڈاکٹر سید شاہ صلاح الدین کو ان کی پچاس سالہ خدمات کے لیے تمغہ پیش کیا گیا۔

''تمل ناڈو میں اردو کا مستقبل'' پر ایک سیمینار مختار بدری کی صدارت میں ہوا جس میں ڈاکٹر ایم، ایچ، جواہر اللہ، ڈاکٹر پی نثار احمد، ڈاکٹر میجر سید شہاب الدین کے علاوہ کئی دانشوروں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

شام کو ایک مشاعرہ حضرت قادر ظہیر کی صدارت میں ہوا جس میں ممتاز لکھنوی، شہزاد آبرو، شاہد مدراسی، مولانا سالک ناظمی، علیم صبا نویدی، ڈاکٹر محمد جمال، حسن فیاض، اکبر زاہد، ماہر مدراسی، سراج شانا، دولت مدراسی، محی الدین اصر، انور تر پاتوری، حکیم سید محمود علی، حکیم یعقوب اسلم وغیرہ نے حصہ لیا۔

(ڈاک سے)

● نئی دہلی۔ 11 فروری، شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام دوسرے توسیعی خطبے کا انعقاد ہوا جس کی صدارت پروفیسر شمس الحق عثمانی نے جبکہ نظامت پروفیسر وہاج الدین علوی نے کی۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے ''انیسویں صدی کا ادب : تہذیبی تبدیلیوں کے درمیان'' کے موضوع پر توسیعی خطبہ دیا۔ انھوں نے کہا کہ انیسویں صدی دراصل علمی وفکری انکشافات کی صدی ہے جس میں ہمہ جہت تبدیلیاں ہوئیں نہ صرف یہ کہ افراد میں خود احتسابی کا شعور پیدا ہوا بلکہ علوم وفنون کے نئے شعبے قائم ہوئے اور تراجم کے ذریعے علمی ترقیوں کی ایک نئی دنیا دریافت کی گئی۔ پروفیسر قدوائی نے کہا کہ یوروپی زبانوں اور ہندوستانی زبانوں میں ترجمے کی روایت نے علم وادب میں ہونے والی تبدیلیوں کو ایک بھر پور جست عطا کی اور یہی زمانہ پرنٹنگ پریس کی آمد کا ہے جو عوامی ذہن کشائی کا سبب بنا۔

صدارتی خطاب میں صدر شعبہ پروفیسر شمس الحق عثمانی نے کہا کہ بے شک انیسویں صدی ہمہ جہت تبدیلیوں کی صدی تھی اور موجودہ زمانے میں ضروری ہے کہ قلب ونظر کی ویسی ہی کشادگی کے ساتھ ہم اپنے اپنے رویوں پر نظر ثانی ضرور کریں تا کہ موجودہ علمی، معاشرتی اور ادبی تعطل ختم ہو سکے۔ انھوں نے کہا کہ ادب بھی موسیقی سے کچھ کم ریاض اور سادھنا کا طالب نہیں ہے۔ توسیعی خطبے کا آغاز شاہنواز فیاض کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● دہلی کے جنوب میں واقع علاقہ میوات اور میوقوم کی ملک کی آزادی کے لیے بیش بہا قربانیاں اور خدمات تو ہیں ہی، لیکن اس علاقے کی اپنی تہذیب، ثقافت اور زبان بھی ہے، جو دہلی سے راجستھان (جنوب) کے بیراٹھ تک اور برج (مشرق) سے نارنول (مغرب) تک بولی جاتی ہے۔ جس میں سینکڑوں رزمیہ اور بزمیہ داستانیں نثر اور نظم میں ملتی ہیں، اس علاقے کی تاریخ پہلی بار مولانا حکیم عبدالشکور نے ''تاریخ میوات'' کے نام سے 1919 میں مرتب کر کے شائع کرائی تھی۔ اس کے بعد اسے ناکافی اور مختصر سمجھ کر انھوں نے ایک مبسوط کتاب قلم بند کی۔ جسے ان کی وفات کے بعد 1974 میں ان کے صاحبزادے حکیم اجمل خاں نے تنقیح وترتیب کے بعد تاریخ میو کھشتری کے نام سے شائع کیا۔ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن حذف و اضافہ کے ساتھ 1994 میں شائع ہوا۔ میوات کی تاریخ تہذیب، اور جنگ آزادی میں اس کی بے مثال قربانیوں کے سلسلے میں معلومات کا مستند ذریعہ یہی کتاب تھی۔

حال ہی میں میوات اور میوقوم کے رہنما چودھری محمد یسٰین خاں مرحوم کی سوانح حیات مرتبہ حکیم اجمل خاں شائع ہوئی ہے، جس میں میوات کی علمی، تعلیمی، سماجی اور رفاہی پیش رفت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ کتاب چودھری یسٰین خاں مرحوم کی سوانح عمری ہی نہیں بلکہ میوات کے 80 سالہ دور جدید کے مدوجزر کی تاریخ بھی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور کتاب ''مہابھارت'' (میواتی) جو کورو پانڈو کے درمیان ہونے والی جنگ ''مہابھارت'' کی میواتی زبان میں منظوم داستان ہے، شائع ہوئی ہے۔ یہ سعد اللہ خاں مرحوم کی لکھی ہوئی ہے اور ''پنڈون کے کڑا'' کے نام سے میوات میں جانی جاتی ہے۔ یہ اب تک سینہ بہ سینہ چلی آرہی تھی۔ اب اس رزمیہ داستان کو حکیم اجمل خاں نے پہلی بار مرتب کر کے اردو رسم الخط میں شائع کر دیا ہے۔ حکیم صاحب کو ہریانہ اردو اکادمی نے جن مجموعی ادبی خدمات پر خواجہ الطاف حسین حالی ایوارڈ سے نوازا ہے، ان میں دونوں کتابیں بھی شامل ہیں۔ علاوہ ازیں دو کتابیں ''میوات کے سوتنتر تا سینانی'' اور ''جنگ آزادی اور میوات'' زیر طبع ہیں۔ شائع شدہ دونوں کتب مولانا آزاد میوات اکیڈمی شکر اوہ ضلع، میوات ہریانہ سے دستیاب ہیں۔

(ڈاک سے)

● علی گڑھ۔ 16 فروری، علی گڑھ نمائش میں منعقدہ نویں اردو جرنلسٹ کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے مہمان خصوصی ڈی۔ آئی۔ جی۔ برج بھوشن نے کہا کہ اردو تہذیب اور محبت کی علامت ہے۔ اس کی توسیع وترقی اور فروغ کے لیے ہم سبھی کو تعاون کرنا چاہیے۔ مسٹر بھوشن نے کہا کہ اپنے دل کے درد کا احساس کرانے کے لیے اردو زبان ایک بہترین وسیلہ ہے اور یہ ایک عام فہم زبان ہے۔ ضلع مجسٹریٹ رام موہن راؤ نے کہا کہ صحافت کے میدان میں آج اردو ایک اہم کردار نبھا رہی ہے۔ صحافیوں کا فرض ہے کہ وہ فسادات کے لیے بدنام اس شہر کی امیج کو بہتر بنانے کے لیے کام کریں، انھوں نے بھروسہ دلایا کہ جگہ کا انتظام ہونے کے ساتھ ہی پریس کلب کی تعمیر کا کام شروع ہو جائے

کا۔ معروف صحافی معصوم مرادآبادی نے کہا کہ اردو تمام دنیا میں بولی جاتی ہے، اس کو صرف مسلمانوں کی زبان قرار دینا ناانصافی ہے۔ اس کے تحفظ کی کوششوں کا ہمیں ازسرنو جائزہ لینا ہوگا۔ اس سے قبل مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار پروفیسر پی. کے. عبدالجلیل نے کہا کہ ہندی اور اردو دو سگی بہنیں ہیں جو یہیں پیدا ہوئیں اور یہیں پروان چڑھیں ان میں بنیادی فرق صرف رسم الخط کا ہے۔

پالی ٹیکنیک کے پرنسپل پروفیسر شمیم احمد نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ حقائق کو صحیح ڈھنگ سے پیش کرنے میں پرنٹ میڈیا کا اہم ترین رول ہوتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ قطعی غیر جانبداری کا مظاہرہ کیا جائے۔ صوبائی کانگریس جنرل سکریٹری پرتیما سنگھ نے کہا کہ اردو ہندوستان میں پلی بڑھی اور اس کے بغیر سبھی زبانیں ادھوری اور نامکمل ہیں۔ صدارتی خطبے میں شہر کے معروف صنعت کار ظفر عالم نے کہا کہ اردو زبان ملک کی مشترکہ تہذیب کا اٹوٹ حصہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ حیدرآباد میں مختلف علوم کی کتابوں کا اردو زبان میں ترجمہ کرنے کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا اگر وہ قائم رہتا تو آج سائنس اور ٹیکنالوجی کی اعلیٰ تعلیم کے لیے ہمیں دوسری زبان کی کتابوں پر انحصار نہ کرنا پڑتا۔ کانفرنس کی نظامت او. ایس. جمال شمسی نے کی۔ کنوینر مبین خاں نے معزز مہمانوں کو یادگاری نشانات سے سرفراز کیا اور سالانہ رپورٹ پیش کی۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● کھتولی۔ یکم مارچ، آزادی سے قبل فارسی زبان ہندوستان کی اہم زبان تھی، اسلامی علوم کا ایک بہت بڑا ذخیرہ اسی زبان میں ہے۔ جس طرح عربی کے بہت سے کلمات اردو میں استعمال ہوتے ہیں اسی طرح فارسی کے الفاظ مستعمل ہیں۔ فارسی علم کے بغیر اردو زبان کے تمام گوشوں سے واقفیت ناممکن ہے۔ ان خیالات کا اظہار مفتی محمد عاشق صدیقی نے بزم ولی اللّٰہی کے زیر اہتمام جامعہ امام ولی اللہ پھلت میں منعقدہ علمی کانفرنس میں کیا۔ اس موقعے پر مولانا ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی نے کہا کہ جلال الدین رومی کی مثنوی، شیخ سعدی کی گلستاں، بوستاں، حافظ شیرازی کا دیوان آج بھی اہم حیثیت کے حامل ہیں۔ مفتی احتشام سیتاپوری نے کہا کہ علامہ اقبال، غالب وغیرہ کے کلام کو گہرائی سے سمجھنے کے لیے فارسی کا علم ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ عربی سے پہلا فارسی ترجمہ کرنے کا شرف حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کو حاصل ہے۔ جلسہ کا آغاز حافظ سلیم قمر نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ صدارت مفتی احتشام سیتاپوری اور نظامت حافظ محمد ادریس قریشی نے کی۔ اس موقع پر بزم ولی اللّٰہی کے اراکین جامعہ کے طلبہ و اساتذہ کے علاوہ کثیر تعداد میں لوگ موجود تھے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● جودھپور۔ مرزا غالب کے 140ویں یوم وفات کے موقع پر بزم اردو جودھپور اور سروکار کے زیر اہتمام مذاکرے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت شین۔ کاف۔ نظام نے کی۔ مہمان خصوصی سپریم کورٹ کے سابق جسٹس مکھراج کلا اور قاضی محمد ایوب انصاری تھے۔ شین کاف نظام نے کہا کہ غالب خود سے اور خدا سے بے تکلف سوال کرتے ہیں۔ بے چینی اور تجسس ان کے کلام کی اہم خوبیاں ہیں۔ میر اور غالب کے اشعار کا تقابلی تجزیہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ میر ہم کلامی کا شاعر ہے تو غالب خود کلامی کا۔ مہمان خصوصی مکھراج کلا نے کہا کہ غالب کے یہاں خودداری اور انکساری کا امتزاج ملتا ہے۔ قاضی محمد ایوب انصاری نے کہا، غالب کو سمجھنے کے لیے اسے بار بار پڑھنا ضروری ہے۔

سوچنا کیندر کے آڈیٹوریم میں منعقد اس مذاکرے میں 'کلامِ غالب پر تحقیقی نظر' کے عنوان سے مقالہ پڑھتے ہوئے ڈاکٹر فرید آفریدی نے کہا کہ غالب کے اشعار کو تاریخی ترتیب سے پڑھ کر ان کے فکری ارتقا کو سمجھا جا سکتا ہے۔ غالب اور عشق کے عنوان سے مقالہ پڑھتے ہوئے راجستھان اردو اکادمی کے سابق وائس چیئرمین اے. ڈی. راہی نے کہا کہ غالب اور میر ایک دوسرے کے بغیر ادھورے ہیں۔ غالب معتقدِ میر ہیں مگر ان کی تقلید نہیں کرتے۔ حبیب کیفی نے کہا کہ غالب کو حالی نے نمایاں کیا اور آج تقریباً ہر زبان میں غالب موجود ہے۔ امین جودھپوری نے اپنے مقالے میں کہا کہ غالب ایسے شاعر ہیں جو کسی کے نقش قدم پر چلنا پسند نہیں کرتے۔

پروگرام کے آغاز میں غالب کی تصویر کے آگے شمع روشن کی گئی۔ ڈاکٹر نثار راہی، اقبال کیف، نرمل ویاس، سنگھوی، کیلاش کبیر، محمد افضل جودھپوری نے گل پوشی سے مہمانوں کا استقبال کیا۔ برجیش عنبر نے شکریہ ادا کیا۔ اس موقعہ پر اردو، ہندی اور راجستھانی کے ادیب موجود تھے۔ نظامت کے فرائض اشراق الاسلام ماہر نے انجام دیے۔ (ڈاک سے)

● جودھپور۔ افسانوں سے متوسط طبقہ غائب ہو گیا تھا مگر موجودہ دور کے افسانوں میں ان کے جذبات اور احساسات کا بخوبی اظہار ہوا ہے۔ ان خیالات کا اظہار شین۔ کاف۔ نظام نے بزم اردو، جودھپور اور سروکار کے زیر اہتمام 'ایک شام افسانے کے نام میں' کیا۔ انھوں نے کہا کہ کہانی وقت بتانے کا نہیں بلکہ وقت بچانے کا آرٹ ہے۔ اکادمی برائے فروغ اردو اساتذہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ڈائرکٹر اور مشہور افسانہ نگار غضنفر نے 'مسنگ مین' عنوان سے افسانہ پڑھتے ہوئے، نسلوں کے فرق اور ان کے تصادم کا ذکر کیا۔ ادے پور کی ڈاکٹر ثروت خان نے 'سرپن' عنوان سے علامتی افسانہ پیش کیا۔ حبیب

کیفی نے 'خزانہ' عنوان کے افسانے میں متوسط طبقے کے مسائل کو خوبصورت انداز میں پیش کیا۔

پروگرام میں ڈاکٹر فرید آفریدی، اے۔ڈی۔ راہی، پروفیسر کنہیا لال راہجر وہت، اشراق الاسلام ماہر، محمد افضل جودھپوری، برجیش عنبر، امیش ساحل نے افسانوں کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ آغاز میں ساغر القادری، نرمل ویاس وغیرہ نے مہمانوں کا گل پوشی سے استقبال کیا۔ اقبال کیف نے شکریہ ادا کیا۔ ڈاکٹر نثار راہی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

(ڈاک سے)

مشاعرے

آئینہ میں نے توڑ دیا، مدتیں ہوئیں
اب کوئی میرا مدِ مقابل نہیں رہا
مخمور سعیدی

● نئی دہلی۔ 24 فروری، غالب اکیڈمی کے 40 ویں یوم تاسیس اور مرزا غالب کے 140 ویں یوم وفات کے موقع پر سہ روزہ تقریبات کے تحت گزشتہ رات غالب اکیڈمی حضرت نظام الدین میں طرحی مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ جس کی صدارت کہنہ مشق شاعر مخمور سعیدی نے کی جبکہ معروف صحافی اور کالم نگار فاروق ارگلی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ شعرا میں مخمور سعیدی کے علاوہ گلزار دہلوی، منور رانا، وقار مانوی، ابرار کرتپوری، ڈاکٹر تابش مہدی، فرحت احساس، فاروق ارگلی، عظمیٰ اختر، اسد رضا، شہپر رسول، شہباز ندیم ضیائی، احمد محفوظ، کمال جعفری، احمد علی برقی، سلیم صدیقی، معین شاداب، افضل منگلوری، رؤف رامش، شریف شہباز، سکندر عاقل، انا دہلوی، فرمان چودھری، متین امروہوی، نرمل سنگھ نرمل، اقبال فردوسی، جمیل اصغر، شان الحق برہانپوری، ممتا کرن، نسیم عباسی، ایس۔یو۔ ظفر اور نعمان شوق شامل تھے۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

بچھڑ کے اپنے قبیلے سے یہ ہوا انجام
بھٹکتا پھرتا ہوں ہر سمت اجنبی کی طرح
مظفر رزمی

● نئی دہلی۔ 23 فروری، بزم ملاقات اور سوروندنا کے اشتراک سے قومی و لسانی یکجہتی کے عنوان سے انڈیا ہیبیٹیٹ سینٹر میں مشاعرے اور کوی سمیلن کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقع پر آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی کے رکن و ممبر پارلیمنٹ ڈاکٹر رتنا کر پانڈے اور ایئر ونگ مارشل ڈاکٹر اجیت تیاگی نے مہمان ذی وقار کی حیثیت سے شرکت کی۔ ڈاکٹر پانڈے نے اپنی افتتاحی تقریر میں اردو۔ہندی دونوں زبانوں کو قریب لانے اور ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کو قائم رکھنے کے لیے بزم ملاقات اور سوروندنا کو مبارک پیش کرتے ہوئے دونوں زبانوں کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔

بزم ملاقات کے صدر شکیل شفائی اور سوروندنا کے صدر راودیش کمار نے اپنی اپنی بزم کے سابقہ پروگراموں سے روشناس کراتے ہوئے منصوبوں کو بھی اجاگر کیا۔ ملاقات کے رکن استاد اقبال احمد خاں اور ہما مظفر نے شعرا و شاعرات کا پھولوں سے استقبال کیا۔ بزم ملاقات کے بانی مرزا محمد عارف نے نظامت کی۔ شریک شاعر اور کوی تھے۔ مظفر رزمی، شکیل شفائی، ظفر مرادآبادی، مرزا عارف، دکشت دکوری، شرف ناناپاروی، تسیم نیازی، رشمی سائن وغیرہ۔ اس خوبصورت شام میں آئی۔ٹی۔ پی۔ او۔ کے سینئر جنرل منیجر صفدر ایچ خان، دہلی اقلیتی مالیاتی کارپوریشن کے ڈائرکٹر محمد طارق صدیقی، فلم ڈائریکٹر محترمہ رنگی اور وریندر شرما نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ آخر میں پروگرام کے کنوینر اطہر لدھیانوی نے سبھی مہمانان اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

عقل و دانش کی کمی کا رنج ہے سب کو مگر
غمزدہ میں ہوں کہ میرے گھر سے نادانی گئی
غضنفر علی

● نئی دہلی۔ 6 مارچ، جامعہ نگر کے طاہر اپارٹمنٹ میں مشہور شاعر فاروق جائسی اور ضیا فاروقی کی دلی آمد پر اعزازی شعری نشست کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر اختر الواسع اور پروفیسر وہاج الدین علوی نے مشترکہ طور پر انجام دی اور نظامت کے فرائض عمیر منظر نے انجام دیئے۔ اس موقع پر پروفیسر خالد محمود نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ صدارتی خطاب میں پروفیسر وہاج الدین علوی نے کہا کہ آج کی شعری نشست بے حد کامیاب رہی۔ پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ اس طرح کی شعری نشستیں ہمیں شاعری کے ایک نئے ذائقے سے آشنا کراتی ہیں۔ شریک شعرا تھے۔ فاروق جائسی، ضیا فاروقی، خالد محمود، شہپر رسول، غضنفر علی، فرحت احساس، عبید الرحمٰن عبید، ملک زادہ جاوید، عمیر منظر، آخر میں پروفیسر تسنیم فاطمہ نے کلمات تشکر ادا کیے۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اک دیا بھی نہ چھوڑا پرکھوں نے
طاق کتنے مرے مکان میں تھے
عرفان احمد

● نئی دہلی۔ 5 فروری، دہلی یونیورسٹی کی کلچر کونسل کی جانب سے آرٹس فیکلٹی کے کنووکیشن ہال میں مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت ممتاز

شاعر منور رانا نے کی۔ پروفیسر ایس. کے. وج نے مشاعرے کا افتتاح کیا۔ کونسل کی سکریٹری پروفیسر چترا گپتا نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ کنوینر ڈاکٹر خالد اشرف نے مشاعرے کی اہمیت اور اردو شاعری کے سیکولر کردار اور روایت پر روشنی ڈالی۔ نظامت معین شاداب نے کی۔ منور رانا کے علاوہ مندرجہ ذیل شعرا نے کلام سنایا۔ پروفیسر کلدیپ سلسل، ڈاکٹر ایم۔آر۔قاسمی، شمس رمزی، ملک زادہ جاوید، ڈاکٹر عفت زریں، عرفان احمد، راغب نوری ٹکرالوی، معین شاداب، پروفیسر جگ موہن رائے بجل، منور سرحدی، راج کمار سچان ہوری، گنز بڑسہوانی۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

جل بجھے رات سے لڑتے ہوئے کتنے ہی چراغ
جس سویرے کی طلب تھی وہ سویرا نہ ہوا

فصیح اکمل

● نئی دہلی۔16 فروری، انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام اور غالب انسٹی ٹیوٹ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور اردو اکادمی کے تعاون سے بستی حضرت نظام الدین میں 'یوم غالب' کے موقع پر احاطہ مزار غالب میں 'غالب کی زمین' میں طرحی مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔ صدارت ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے اور نظامت فصیح اکمل قادری نے کی۔ ڈاکٹر کمال احمد صدیقی کے علاوہ اسد رضا، ظفر مراد آبادی، کمال جعفری، فصیح اکمل، ابرار کرت پوری، شہباز ندیم ضیائی، متین امروہوی، نسیم دھامپوری، بھٹنا گر شاداب، شفیق احمد ندوی، اور ہمایوں ظفر زیدی نے اپنے کلام سے نوازا۔

اس موقع پر ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر عقیل احمد، وشنو کھرے، پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی، پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر علی احمد فاطمی وغیرہ موجود تھے۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

بوڑھی ماں کے ضعیف چہرے کو
پیار سے دیکھنا عبادت ہے

عظمیٰ اختر

● نئی دہلی۔22 فروری، ادبی تنظیم 'اردو ادارہ' کے زیر اہتمام اردو اکادمی چھتیس گڑھ کی سابق چیئر پرسن اور معروف شاعرہ عظمیٰ اختر کے اعزاز میں غالب اکیڈمی حضرت نظام الدین میں ایک مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت الحاج حافظ سلیم احمد نے کی جبکہ نظامت کے فرائض معین شاداب نے انجام دیے۔ اس موقع پر اردو ادارہ کی جانب سے عظمیٰ اختر کو پروین شاکر ایوارڈ اور ایک سپاسنامہ بھی پیش کیا گیا۔ ادارے کے جنرل سکریٹری شہباز ندیم ضیائی نے عظمیٰ اختر کی اردو زبان و ادب کے لیے خدمات پر روشنی ڈالی۔ حسب ذیل شعرا نے کلام سنایا۔ حسب ذیل شعرا نے کلام سنایا۔ وقار مانوی، عظمیٰ اختر، طالب رامپوری، شہباز ندیم، متین امروہوی، ڈاکٹر نگار عظیم، کمال جعفری، خورشید حیدر، راشد حامدی، انور باری، سلیم صدیقی، معین شاداب، راشد عزیز، جاوید مشیری، اقبال فردوسی، رؤف رامش، پرویز جامعی، ثمر بچھرایونی، عدیل سانکھوی، وارث وارثی۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

چھین لیں آنکھیں مگر خواب تو رہنے دیتے
کوئی ہلچل سی تہہ آب تو رہنے دیتے

محمد مختار وفا

● بتیا، اردو زبان و ادب کی ترقی اور مشترکہ تہذیب کو فروغ دینے کی خاطر فعال تنظیم 'ادبی سنگم' بتیا کی جانب سے ممتاز افسانہ نگار اور شاعر شاکر کریمی کی صدارت میں "اردو کا ادبی منظر نامہ" کے عنوان سے ایک مذاکرے اور مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ نظامت کے فرائض منظر سلطان نے ادا کیے۔ مذاکرے ہوئے ڈاکٹر ابوظہیر ربانی نے کہا کہ علاحدگی پسندی، منافرت اور ٹکراؤ کے موجودہ ماحول میں ادیبوں کی ذمہ داریاں مزید بڑھ جاتی ہیں۔ محمد مختار وفا نے کہا کہ تخلیقی ادب کے لیے سماجی وابستگی ناگزیر ہے۔ معاشرے کے احساسات اور مسائل سے کٹ کر کوئی بھی تخلیق دیرپا ثابت نہیں ہوسکتی۔ مولانا حسن معاویہ ندوی اور جے نرائن پرساد رائے نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مشاعرے میں جن شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا ان میں شاکر کریمی، عزیز ربانی، حسن معاویہ ندوی قیصر، ساحر بتیاوی، محمد مختار وفا، منظر سلطان، ابوالخیر نشتر، گورکھ مستانہ، عبدالمجید خاں مجید، کشوری لال انشو مالی، افتخار وصی، مرزا کھونچ، نسیم احمد نسیم، نوشاد احمد کریمی، ظفر امام، قمر الزماں قمر، سریش گیت، اختر حسین اختر، ذاکر حسین ذاکر، شمیم افضل، آزاد اظہر کے اسمائے گرامی خاص ہیں۔ (ڈاک سے)

رسم اجرا

حیدرآباد کی علمی فیض رسانی

● حیدرآباد۔ 9 فروری، ڈاکٹر سید داؤد اشرف کی کتاب "حیدرآباد کی علمی فیض رسانی" کے جلسۂ رسم اجرا میں پروفیسر عبدالستار دلوی نے اپنی صدارتی تقریر میں ڈاکٹر داؤد اشرف کے تحقیقی کام کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے اپنے تمام تحقیقی مضامین، نہایت مستند حوالوں کی بنیاد پر قلم بند کیے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہر شہر کی ایک تاریخ ہوتی ہے اور یہ ضروری ہے کہ

ہر شہر کی سیاسی، تہذیبی اور معاشرتی تاریخ مرتب کی جائے۔ اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے خود انھوں نے شہر پونا کی ایک ایسی ہی تاریخ مرتب کی ہے۔شہر حیدرآباد پونا کے مقابل بہت بڑا شہر ہے۔ اس کے لیے 25 جلدوں میں تاریخ مرتب کی جانی چاہیے۔ عامر علی خان نیوز ایڈیٹر سیاست نے کتاب کی رسمِ اجرا انجام دیتے ہوئے مصنف کو مبارکباد دی۔ انھوں نے کہا کہ داؤد اشرف بڑی محنت، لگن اور عرق ریزی کے ساتھ تحقیقی کام کررہے ہیں۔ پروفیسر اشرف رفیع نے کہا کہ داؤد اشرف کے تحقیقی کارنامے ریاست حیدرآباد خصوصاً آصف سادس اور آصف سابع کی علمی اور ادبی فیاضیوں کا دستاویزی ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ وہ ایک دیانت دار اور ہمہ وقتی محقق ہیں۔ آج بھی محقق ان کی کتابوں سے استفادہ کرتے ہیں اور ان سے شخصی طور پر حوالے دریافت کرتے ہیں ڈاکٹر عقیل ہاشمی نے کہا کہ داؤد اشرف نے فی الواقع اپنی تحقیقی بصیرت، علمی شغف، جولانی طبع اور اصابت رائے سے عہد عثمانی کے کارناموں کو حیات دوام بخشا ہے۔ ڈاکٹر داؤد اشرف نے اپنی تقریر میں کہا کہ مذہبی رواداری، عوام کی فلاح و بہبود کے کاموں سے دلچسپی، علم و ادب کی سرپرستی اور تعلیم کی اشاعت اور فروغ پر خصوصی توجہ آصف جاہی حکمرانوں کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ آصف سابع نے ان مثبت روایات کو مستحکم کیا اور آگے بڑھایا۔ ابتدا میں کنوینر جلسہ ڈاکٹر مصطفیٰ کمال نے خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ آرکائیوز کے ریکارڈ پر مبنی ڈاکٹر داؤد اشرف کی 10 تحقیقی کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ عہد آصفی کی تاریخ پر ان کی تحریروں کو استناد حاصل ہے۔ اس جلسے میں ڈاکٹر راجندر پرشاد، پروفیسر محسن عثمانی، غلام یزدانی ایڈوکیٹ، پروفیسر عصمت مہدی، طالب خوندمیری، شاہد حسین، شکیل احمد، جمیل احمد، اسلم فرشوری، یٰسین احمد، قدیر انصاری، حسین اشرف کے علاوہ ادیبوں، شاعروں اور اساتذہ کی بھاری تعداد شریک تھی۔ (منصف، حیدرآباد)

سفر تمام ہوا

● دیوبند۔ 4 فروری، اردو ٹیچرس ویلفیئر ایسوسی ایشن کی جانب سے مشہور و معروف شاعر ساحل فریدی کے مجموعہ کلام ''سفر تمام ہوا'' کی تقریب رسم اجرا میں جامعہ امام انوریہ کے مہتمم مولانا نسیم اختر شاہ قیصر نے کہا کہ سہارنپور کی سطح پر ہی نہیں بلکہ اردو دنیا میں ساحل فریدی مرحوم نے اپنی شناخت قائم کی۔ انھوں نے کہا کہ شعر کہنا آسان کام نہیں اور پھر ایسے شعر جو فکر و فن کا اعلیٰ نمونہ ہوں اور ایسے ہزاروں نمونے اگر کسی شاعر کے یہاں ہوں تو وہ شاعر اور اس کا کلام ادب کا قیمتی سرمایہ بن جاتے ہیں۔ صدارت کررہے پروفیسر تنویر چشتی نے کہا کہ ساحل فریدی ایک ایسے شاعر تھے جنھوں نے شاعری میں تازگی کا احساس برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ مسائل زمانہ کو اپنی گفتگو کا موضوع بنایا۔ دہلی سے آئے ایم رحمان نے کہا کہ ساحل فریدی وہ فنکار تھے جنھوں نے زندگی کی سچائیوں کو اپنی شاعری کا مرکز بنایا اور خیال و تصور کی دنیا سے باہر آکر حقائق کا جہاں آباد کیا۔ رسم اجرا مشترکہ طور پر ایم رحمان تنویر چشتی اور نسیم اختر شاہ قیصر نے ادا کی۔ پروگرام کی نظامت سید وجاہت شاہ نے کی۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

سیاست میں صلاح الدین نیر کے 50 سال

● حیدرآباد۔ 3 فروری، صلاح الدین نیر کی کتاب ''سیاست میں صلاح الدین نیر کے 50 سال'' ایک دستاویزی کتاب ہے جس میں سیاست، جناب عابد علی خان اور جناب محبوب حسین جگر کی خدمات کو والہانہ انداز میں خراج پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ انسانی رشتوں اور بے لوث خدمات کی ہر دور میں اہمیت رہی ہے۔ ان تاثرات کا اظہار وہ شعرا و ادبا کررہے تھے جو اس کتاب کی اجرا کی تقریب میں شریک تھے۔ عثمان شہید ایڈوکیٹ نے رسم اجرا انجام دی۔ سید شاہ نورالحق قادری نے صدارت کی۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر عبدالرزاق فاروقی، ڈاکٹر بشیر احمد، مولانا نادر المسدوسی، نہپال سنگھ ورما نے شرکت کی۔ اس موقعے پر اثر غوری کی صدارت میں مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ مشاعرے میں اثر غوری، صلاح الدین نیر، سلیم عابدی، قدیر انصاری، فیض الحسن خیال، نہپال سنگھ ورما، قاضی فاروق عارفی، نادر المسدوسی، فرید سحر، افضل عارفی، بصیر افضل، یوسف روش اور دیگر شاعروں نے کلام سنایا۔ عثمان شہید نے کہا کہ صلاح الدین نیر نہ صرف نامور شاعر ہیں بلکہ ممتاز ادیب بھی ہیں۔ نورالحق قادری نے کہا کہ صلاح الدین کا شمار حیدرآباد کے صف اول کے شاعروں میں ہوتا ہے۔ نیز وہ ایک بے باک صحافی بھی ہیں۔ (منصف، حیدرآباد)

سرخ آبی پرندہ

● کولکاتا۔ مسلم انسٹی ٹیوٹ کی لٹریری کمیٹی کے زیر اہتمام اشرف یعقوبی کی کتاب ''سرخ آبی پرندہ'' کا اجرا عمل میں آیا۔ ممتاز شاعر قیصر شمیم نے اجرا فرمایا جبکہ صدارت کے منصب پر فائز تھے جناب سعید پریمی۔ انجم عظیم آبادی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ انھوں نے صاحب کتاب کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ اشرف یعقوبی کی زندگی کا بیشتر حصہ جہد مسلسل میں گزرا

ہے۔ ان کی شاعری میں متوسط طبقے کے کرب کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ احمد کمال حشمی نے کہا کہ اشرف سیدھے سادے انداز میں شاعری کرتے ہیں۔ ڈاکٹر عاصم شہواز شبلی نے کہا کہ اشرف کی شاعری کچلے ہوئے طبقے کی ترجمان ہے۔ مسلم صابر نے کہا کہ شاعر نے جو کچھ محسوس کیا ہے اسے اپنی شاعری میں سمو دیا ہے۔ حبیب ہاشمی نے کہا کہ ان کے یہاں مشاہدات اور احتجاج دونوں ہیں۔

ڈاکٹر نسیم احمد نسیم (پٹنہ) نے بطور مہمان خصوصی اس تقریب میں شرکت کی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ اشرف یعقوبی کی شاعری اکہری نہیں، وہ تمام شاعرانہ اوصاف سے متصف ہے۔ ان کے یہاں غزل مسلسل کی خصوصیت ایک الگ ذائقے سے روشناس کراتی ہے۔ پروفیسر سلمان خورشید نے کہا کہ سماجی جبر اور معاشرتی گھٹن کو جس طرح شاعر نے محسوس کیا ہے، اسے شاعری میں پرو دیا ہے۔ انیس رفیع نے اشرف کی نظموں کو موضوع گفتگو بناتے ہوئے اشرف یعقوبی کو قلندر شاعر قرار دیا۔ اشرف یعقوبی نے کہا کہ میری شاعری کے حوالے سے جو باتیں ہوئیں ان سے میں روشنی حاصل کروں گا۔ قیصر شمیم نے کہا کہ شاعر نے روایتی انداز سے انحراف کیا ہے اور ایسی زبان استعمال کیا ہے جو عوام پر اثر انداز ہو۔ ان کے یہاں تجربات کا تیکھاپن ہے۔ صدر محفل سعید پریمی نے کہا کہ آنے والا وقت ان کی شاعری کو اعزاز عطا کرے گا۔ (ڈاک سے)

دروازہ ابھی بند ہے

● 8 فروری 2009 کو مرزا غالب کالج گیا میں ایک ادبی نشست کا انعقاد کیا گیا جس میں احمد صغیر کے تازہ ناول ''دروازہ ابھی بند ہے'' اور کرشن چندر چودھری کمل کے شعری مجموعے ''قلم بول اٹھا'' کی رسم اجرا عمل میں آئی۔ اس موقع پر مشہور کہانی کار ڈاکٹر حسین الحق نے کہا کہ احمد صغیر کیا منجھے ہوئے فنکار ہیں ان کا یہ ناول آدھا تخلیقی اور آدھا صحافتی ہے چودھری کمل کے مجموعے کے حوالے سے انھوں نے کہا، اردو سب کی زبان ہے اور سب کو اس میں لکھنے کا حق ہے۔ ڈاکٹر محفوظ الحسن نے کہا کہ احمد صغیر کے یہاں موضوع کی گرفت بہت مضبوط ہے۔ کمل کے دل میں انسانیت کا درد ہے۔ مسعود منظر نے کہا کہ احمد صغیر اب ایک بلند آواز بن چکے ہیں اور کمل کی شاعری کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ کرشن کمار نے کہا کہ گجرات کو احمد صغیر نے ایک علامت کے طور پر دیکھا ہے اور اس پر ناول لکھنا آسان نہیں تھا۔ ان کے علاوہ علیم اللہ حالی، ڈاکٹر نسیم ابن حمد، فیضان عزیزی، فردوس گیاوی فرحت قادری اور خالق حسین پردیشی نے بھی اظہار خیال کیا مجلس صدارت میں ڈاکٹر افصح ظفر، ڈاکٹر حسین الحق، ڈاکٹر محفوظ الحسن، فرحت قادری اور کرشن کمار تھے۔ نظامت سید احمد قادری نے کی۔ (ڈاک سے)

وفیات

ابوالمجاہد زاہد

● نئی دہلی۔ 6 مارچ، اردو کے مشہور تعمیر پسند شاعر ابوالمجاہد زاہد کا آج طویل علالت کے بعد میڈیکل کالج علی گڑھ میں انتقال ہو گیا۔ وہ 81 سال کے تھے۔ ان کے پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ ابو المجاہد زاہد کو سیماب اکبرآبادی کے شاگرد ہونے کا شرف حاصل تھا۔ مرحوم کا پہلا مجموعہ ''تگ وتاز'' تقریباً نصف صدی پہلے منظر عام پر آیا تھا۔ 'کھلتی کلیاں' بچوں کی شاعری کا مجموعہ ہے۔ چند برس پہلے 'ید بیضا' کے نام سے حمد و نعت، منقبت اور غزلوں پر مشتمل مجموعہ شائع ہوا تھا۔ انھوں نے اپنی عملی زندگی ادبی صحافت سے شروع کی۔ ماہنامہ 'نئی نسلیں' کے علاوہ ''دبدبہ'' سکندری'' اور پندرہ روزہ اخبار 'برادری' کے مدیر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ وہ طویل عرصے سے جماعت اسلامی ہند کے شعبہ تعلیمات میں درسیات کے اڈیٹر تھے۔ ان کا شمار ہندو پاک کے معروف اساتذۂ فن میں کیا جاتا ہے۔ انھوں نے شاعری کے سماجی پہلو اور اس کے تعمیری کردار کی بہترین نمائندگی کی۔

مولانا ابوالمجاہد زاہد کی شاعری میں اعلیٰ اخلاقی قدروں کی ترجمانی کے ساتھ فنی معیاروں کی پاسداری بھی ہے۔ ان کے ہاں مقصد اور معیار کی جو یکجائی نظر آتی ہے، اس کی مثالیں کم کم ہی کہیں اور نظر آئیں گی۔

گووند سروپ رشک رام پوری

● پچھلے دنوں رام پور کے استاد شاعر گووند سروپ رشک رام پوری کا انتقال ہو گیا۔ وہ رامپور کے ایک کایستھ گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور ابر حسنی گنوری کے شاگرد تھے۔ ان کے انتقال کے بعد نور میاں ضیا مجددی اور شفا گوالیاری سے مشورہ کرتے رہتے تھے۔ خود ان کے شاگردوں میں سلیم خاور اور شکیب ماہر قابل ذکر ہیں۔ رشک صاحب مقامی و غیر مقامی شعری نشستوں میں شرکت کرتے رہتے تھے۔ لیکن چند سال قبل بینائی زائل ہو جانے کے بعد گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر لگ بھگ ستر سال تھی۔

□□□

قومی اردو کونسل کی اہم مطبوعات

اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک

مصنف: خلیل الرحمن اعظمی

اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک خلیل الرحمن اعظمی کی تحقیقی اور تنقیدی کتاب ہے۔ اس کتاب میں تعارف اور مقدمے کے علاوہ تین ابواب ہیں، جو ترقی پسند مصنفین کی تحریک، ترقی پسند ادبی سرمائے کا جائزہ اور ترقی پسند تنقید ایک تجزیاتی مطالعہ پر مشتمل ہیں۔ رشید احمد صدیقی نے جو اس مقالے کے نگراں تھے، خلیل الرحمن اعظمی کے تلاش و تحقیق کے طریقۂ کار، قابلِ قدر مواد کی فراہمی اور اس کی ترتیب اور تجزیے کی تعریف و توصیف کی ہے۔ خلیل الرحمن اعظمی نے جو مقدمہ لکھا ہے وہ کئی معنوں میں فکر انگیز ہے۔

صفحات: 410، قیمت: -/241 روپے

تحقیق کا فن

مصنف: گیان چند جین

اردو میں اصول تحقیق پر اگرچہ متعدد کتابیں آچکی ہیں لیکن ان میں اس کتاب کو کوئی اعتبار سے انفرادیت حاصل ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں کل 22 ابواب قائم کیے ہیں جن میں مختلف مفکرین کی آرا کے ذریعے تحقیق کی اقسام اور مقاصد پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تحقیق، تنقید اور ترتیب کے اشتراک و اختلاف، موضوع کے انتخاب، محقق اور نگراں کے اوصاف، مقالے کی نوعیت، زبان و بیان کی صحت اور قطعیت، مقالے میں استعمال ہونے والے رموز و اوقاف، کتاب بندی اور فہرست سازی کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔

صفحات: 650، قیمت: -/170 روپے

آزادی کے بعد اردو کا طنز و مزاح

مرتب: ابوالکلام قاسمی

پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے آزادی سے تقریباً ربع صدی قبل سے نصف صدی بعد تک کے معتبر طنزیہ و مزاحیہ مضمون نگاروں کو اس کتاب میں یکجا کیا ہے، جن میں انجم مانپوری، ملا رموزی، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، شوکت تھانوی، کنھیا لال کپور، فکر تونسوی، حسنین عظیم آبادی، ابراہیم جلیس، یوسف ناظم، احمد جمال پاشا، مجتبیٰ حسین، شفیقہ فرحت اور اعجاز علی ارشد جیسے 25 قلم کاروں کی تخلیقات شامل ہیں۔ اس انتخاب سے آزادی کے بعد لکھے جانے والے مزاحیہ ادبی سرمایے کی ارتقائی منازل کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ متن اردو اور ہندی دونوں رسم الخطوں میں ہے۔

صفحات: 655، قیمت: -/457 روپے

وضاحتی کتابیات (22 جلدوں میں)

مرتب: مظفر حنفی

پروفیسر مظفر حنفی نے قومی اردو کونسل کے ایک منصوبے کے تحت سال بہ سال شائع ہونے والی کتابوں کے تعارف اور مختصر تبصرے پر مبنی ''وضاحتی کتابیات'' کل 22 جلدوں میں مرتب کی ہے۔ ہر برس کی کتابوں کا ذکر الگ الگ جلدوں میں ہے۔ موصوف نے وضاحتی کتابیات کے متعینہ اصولوں پر کاربند رہتے ہوئے کم سے کم الفاظ میں متعلقہ کتاب کے بارے میں معروضیت کے ساتھ ضروری اطلاعات فراہم کردی ہیں، جن کے وسیلے سے محقق اور طالب علم مطلوبہ معلومات حاصل کرسکتے ہیں۔

22 جلدوں کی مجموعی قیمت: -/2693 روپے

بیسویں صدی (نصف اول) کے اردو مصنفین

مصنفہ: سجیدہ خاتون

اس کتاب میں متعلقہ دور کے مصنفین کے ابتدائی حالات، تعلیمی مراحل اور مشاغل حیات کی تفصیلات فراہم کی گئی ہیں۔ قلم کاروں میں شعرا، ناول نگار، افسانہ نگار، ڈراما نگار، محققین، ناقدین، طنز و مزاح نگار اور صحافیوں کے علاوہ سوانح، تاریخ اور اسلامی لٹریچر کی نمائندہ شخصیات شامل ہیں۔ اردو میں سوانحی حوالوں کی کتابوں کی کمی کھلتی ہے، یہ کتاب اسی خلا کو پر کرنے کی ایک کوشش ہے جو 147 ادبا کے مختصر تذکروں پر مبنی ہے۔

صفحات: 570، قیمت -/137 روپے

کلیات حسن نعیم

مرتب: احمد کفیل

نئی غزل کے پیش رووں میں حسن نعیم کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کی شاعری میں جو بانکپن نظر آتا ہے وہ اردو کی غزلیہ شاعری کی روایت میں انفرادیت کا حامل ہے۔ قومی اردو کونسل نے اردو کے ادبی سرمائے کے مستند متون کی اشاعت میں اہم کلاسیکی مصنفین اور بیسویں صدی کے معتبر تخلیق کاروں کی کلیات شائع کرنے کا جو سلسلہ شروع کیا ہے ''کلیات حسن نعیم'' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس میں حسن نعیم کی تمام شعری تخلیقات تاریخی ترتیب سے جمع کردی گئی ہیں۔

صفحات: 335، قیمت: -/185 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دھلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب %45 اور %40 کی خصوصی رعایت دی جاتی ھے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ھے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

تبصرہ وتعارف

کلیات راجندر سنگھ بیدی (جلد اول افسانے)

مرتب: وارث علوی

صفحات: 1040، قیمت: 225 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک ۔ 1، ونگ ۔ 6، آر. کے. پورم، نئی دہلی ۔ 66

مبصر: مخمور سعیدی، J-3/141C، کرشنا کنج ایکسٹنشن، لکشمی نگر، دہلی-92

پچھلی صدی کے بڑے اردو افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام راجندر سنگھ بیدی کا ہے جنھوں نے انسانی نفسیات کو مرکز میں رکھ کر اس کے اردگرد ایسے افسانوی تانے بانے بنے ہیں جو حقیقی زندگی کے بہت قریب ہیں۔ یوں تو بیدی نے فکشن کی دوسری اصناف میں بھی اپنے جادو نگار قلم کے جوہر دکھائے ہیں لیکن ان کے لکھے ہوئے مختصر افسانے اردو افسانے کی سمت و رفتار کے سنگ میل قرار دیے جاسکتے ہیں۔

بیدی یکم ستمبر 1915 کو لاہور میں پیدا ہوئے، ان کی ماں سیوا دیوی ہندو برہمن خاندان سے تھیں اور باپ بابا ہیرا سنگھ کھتری سکھ تھے۔ بیدی کی ماں جو اردو، ہندی اور تھوڑی بہت انگریزی جانتی تھیں بچپن میں انھیں جنوں اور پریوں کی کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔ بیدی کو خود کہانی کہنے کا شوق شاید یہیں سے ہوا، یہ اور بات ہے کہ انھوں نے خیالی جنوں اور پریوں کی نہیں، جیتے جاگتے انسانوں کی کہانیاں کہیں۔ ان کے والد کو بھی کتابیں پڑھنے کا چسکا تھا، وہ بازار سے کرائے پر کتابیں لاتے جن میں زیادہ تر مہماتی ناول ہوتے۔ ان کتابوں نے بھی بیدی کو خود لکھنے کی ترغیب دی۔

انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کرنے کے بعد بیدی پوسٹ آفس میں نوکر ہوگئے۔ یہاں بھی ان کا سابقہ کتابوں اور رسالوں کے ساتھ رہا۔ یہیں انھوں نے وہ کہانیاں لکھنی شروع کیں جو آگے چل کر ان کی انفرادی پہچان بنیں۔ ان کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ ''دانہ ودام'' کے نام سے 1937 میں شائع ہوا اور بہ طور افسانہ نگار ان کی شہرت ملک کے طول وعرض میں پھیل گئی۔ اس کے بعد بیدی کے پانچ مجموعے اور منظر عام پر آئے جن کے نام ہیں: ''گرہن'' (1942) ''کوکھ جلی'' (1949) ''اپنے دکھ مجھے دے دو'' (1965) ''ہاتھ ہمارے قلم ہوئے'' (1974) اور ''مکتی بودھ'' (1982) کلیات کی زیرنظر جلد میں ان سبھی مجموعوں کے افسانے شامل ہیں۔ ان مجموعوں میں جو غیر افسانوی تحریریں یا بیدی کے لکھے ہوئے پیش لفظ شامل تھے، وہ مرتب نے نکال دیے ہیں، ''عرض مرتب'' وضاحت ہے کہ ان کا ارادہ ان چیزوں کو ایک الگ جلد میں پیش کرنے کا ہے۔

بیدی کے انتقال کے بعد پروفیسر شمس الحق عثمانی نے بیدی کے ایسے کئی افسانے پرانے رسائل کی فائلوں سے ڈھونڈ نکالے تھے جو مندرجہ بالا مجموعوں میں شامل ہونے سے رہ گئے تھے یا دانستہ شامل نہیں کیے گئے تھے۔ ان افسانوں کو انھوں نے بیدی کے انتقال کے بعد ''باقیاتِ بیدی'' کے نام سے مرتب کرکے کتابی صورت میں شائع کردیا تھا۔ وارث علوی نے عثمانی صاحب کی اجازت اور ان کے شکریے کے ساتھ یہ افسانے بھی لے لیے ہیں جن کی تعداد بارہ ہے۔ ''دانہ ودام'' میں چودہ ''گرہن'' میں چودہ ''کوکھ جلی'' میں بارہ ''اپنے دکھ مجھے دے دو'' میں نو ''ہاتھ ہمارے قلم ہوئے'' میں سات اور ''مکتی بودھ'' میں پانچ افسانے شامل تھے۔ اس طرح کلیات میں شامل افسانوں کی تعداد چوہتر ہوگئی ہے۔

بیدی کی کتابیں اب آسانی سے دستیاب نہیں ہیں۔ قومی اردو کونسل نے انھیں کلیات کی شکل میں شائع کرنے کا فیصلہ کرکے ایک اہم کام کیا ہے۔ کلیات کی جلد دوم جس میں بیدی کے ناولٹ، ڈرامے، مضامین اور خطوط شامل ہیں، کونسل پہلے شائع کرچکی ہے، جلد اول جو افسانوں پر مشتمل ہے، اب شائع ہوئی ہے۔

متن میں لفظی غلطیوں اردو کتابوں کا مقدر بن کر رہ گئی ہیں۔ علوی صاحب کی نظر جہاں جہاں ایسی غلطیوں پر پڑی ہے، انھیں انھوں نے بریکٹ میں واضح کردیا ہے۔ شروع میں ان کا مبسوط تعارفی مضمون ''راجندر سنگھ بیدی کے افسانے'' شامل ہے جو بیدی کے ساتھ ان کے ذہنی شغف کو بھی ظاہر کرتا ہے اور بیدی کے فکروفن کے اہم پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔

مقدمۂ کلام آتش

مصنف: خلیل الرحمن اعظمی

صفحات: 134، قیمت: -/129 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک ۔ 1، ونگ ۔ 6، آر. کے. پورم، نئی دہلی ۔ 110066

مبصر: فیاض احمد وجیہہ، 117، ستلج ہاسٹل، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی-67

خلیل الرحمن اعظمی کا یہ مقالہ جب وہ بی.اے. کے طالب علم (1948) تھے، نیاز فتح پوری کے مشہور زمانہ رسالے ''نگار'' میں ادارتی نوٹ کے ساتھ بالاقساط شائع ہوا۔ مشاہیر ادب نے اس کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور جی کھول کر داد دی۔ احوال واقعی اور تمہید کے علاوہ زیر تبصرہ کتاب کے مشتملات اس طرح ہیں: تذکرہ، چھان بین، آتش کا فن (تین حصوں میں)، عشقیہ شاعری، خمریات، تصوف اور مسائل حیات۔ کتاب کی جامعیت کا احساس بادی النظر میں ہی ہوجاتا ہے۔ تمہید کے عنوان سے آل احمد سرور نے آتش کے

فکروفن پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور اس کتاب کے مشتملات کو بھی روشن کیا ہے۔ یہ تمہید ایک مضمون کی حیثیت رکھتی ہے۔ پہلا باب جو تذکرہ کے عنوان سے ہے اس میں آتش کے احوال وکوائف اور ان کی زندگی کے اہم نقوش کو مستند حوالوں سے اجاگر کیا گیا ہے۔ چھان بین کے عنوان سے آتش کے شاعرانہ مرتبے کے تعین کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے لیے خلیل الرحمٰن اعظمی نے محمد حسین آزاد، عبدالسلام ندوی، شیفتہ، امداد امام اثر، رام بابو سکسینہ، کلیم الدین احمد، آل احمد سرور، فراق گورکھپوری اور سید عبداللہ وغیرہ کی آرا کے علاوہ غالب کے ایک خط کو بنیاد بنایا ہے، اور بعض ایسے پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ آتش کا شاعرانہ مزاج لکھنؤ اسکول کا پیرو ہوتے ہوئے بھی منفرد واقع ہوا ہے۔ اس مطالعے میں آتش کو نہ صرف ناسخ پر فوقیت دی گئی ہے بلکہ بعض حوالوں کی روشنی میں ان کو میر اور غالب کے پہلو میں جگہ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ آتش کا فن، یہ باب تین حصوں میں ہے، جس میں آتش کے فنی امتیازات کو واضح کیا گیا ہے اور ان کے نظریۂ فن کو ان کے اشعار کی روشنی میں مرتب کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ مثلاً آتش معنی کی تہہ داری کے خواہاں ہیں، ان کے تخلیقی عمل میں خیال کو اولیت حاصل ہے اس کے بعد بندش الفاظ کو۔ ان کے کلام میں ناسخ کے کلام کے مقابلے میں شاعرانہ اور تخلیقی عناصر زیادہ ہیں۔ اس تفصیلی مطالعے میں ان مصرعوں کو بھی نقل کیا گیا ہے جو ضرب المثل بن گئے ہیں، مثلاً

- بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے
- بس ہو چکی نماز مصلّیٰ اٹھائیے
- زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجیے دہن بگڑا
- ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

اس مطالعے میں بعض مقامات ایسے بھی ہیں جہاں ان کی تنقید یک رخی ہوگئی ہے۔ بلاشبہ عقیدت ومحبت، تنقید کے منافی ہے، اس کے باوجود یہ باب اعظمی صاحب کی تنقیدی بصیرت کو ظاہر کرتا ہے۔ عشقیہ شاعری کے عنوان کے تحت بھی آتش کے انفراد وامتیاز کے تعین کی کوشش کی گئی ہے۔

اس باب میں اعظمی صاحب کی اکثر باتوں سے اتفاق کیا جاسکتا ہے۔ مگر بعض جگہوں پر وہ آتش کے ہاں عاشق ومعشوق کی جنس نفسیات پر اصرار کرتے ہیں اور ان کی جنسیت کو صحت مند قرار دیتے ہیں، ان کی رائے کچھ مبالغہ آمیز ہوگئی ہے۔ چوں کہ ان کے بعض اشعار میں ابتذال کی کیفیت نمایاں ہے، یہ دو شعر ملاحظہ فرمائیں:

دوست کو لے کر بغل میں رات بھر سوتا ہوں میں
رشک ہے دشمن کو میرے طالع بیدار پر
شادیِ وصل میں ہوں جامے سے باہر دونوں
میں برہنہ اسے دیکھوں تو وہ عریاں مجھ کو

خلیل الرحمٰن اعظمی اس کو پرخلوص جنسیت اور ہم آہنگی قرار دیتے ہیں، جبکہ یہاں دو کرداروں کے فطری تفاعل سے زیادہ ایک کردار کی ذہنی آوارگی کا گمان ہوتا ہے۔ دراصل یہ اس زمانے کی تنقید ہے جب وہ بی.اے. کے طالب علم تھے۔ اس کا ان کو بھی احساس تھا، چنانچہ احوال واقعی کے تحت لکھتے ہیں:

''یہ کہنا بے سود ہے کہ اس موضوع پر اب لکھتا تو اس کی کیا نوعیت ہوتی، ہاں اس مقالے کی اشاعت اب بھی افادیت سے خالی نہیں اس لیے کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی آتش کو کسی اور ناقد یا محقق نے لائق التفات نہ سمجھا۔''

خمریات کے عنوان کے تحت انھوں نے جو انتخاب پیش کیا ہے، وہ بلاشبہ آتش کے عمدہ اشعار پر مشتمل ہے۔ تصوف کے عنوان سے اعظمی وکیل کی حیثیت سے نہیں بلکہ ذی فہم نقاد کی حیثیت سے آتش کے مرتبے کا تعین کرتے ہیں۔ یہ باب اس لحاظ سے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں ان کے شاعرانہ مزاج اور شخصی مزاج کے باہم ارتباط کو روشن کیا گیا ہے۔ اعظمی صاحب یہ کہنے میں حق بہ جانب ہیں کہ آتش کے ہاں عظمت انسان کا جو احساس ہے وہ تصوف کی دین ہے۔ مسائل حیات، میں آتش کے اس نقطۂ نظر کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو انسانی نفسیات کے گہرے مشاہدے اور عام انسانوں کے دکھ سکھ کا ترجمان ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی اس تفصیلی مطالعے کے بعد سوال کرتے ہیں:

''جس شاعر کے کلام میں اتنی وسعتیں سما گئی ہوں کیا اس کے متعلق اب بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا شاعرانہ مرتبہ کیا ہے۔'' خلیل الرحمٰن اعظمی نے دو ٹوک فیصلے سنانے کے بجائے اپنی تنقید کو تخلیق کی باز آفرینی کے طور پر پیش کیا ہے، لیکن یہ تنقید محض تخلیق کی باز آفرینی نہیں کچھ اور بھی ہے۔ چنانچہ تنقید اور تخلیق کی خودمختاریت کو محسوس کرنے کے لیے مقدمۂ کلام آتش، کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ پہلی دفعہ یہ مقالہ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ سے 1990 میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اس کی اہمیت وافادیت کے پیش نظر 2008 میں اسے دوبارہ شائع کیا ہے۔ پروف کی بعض خامیاں رہ گئی ہیں۔ مصنف کو مرتب لکھا گیا ہے۔ کتاب عمدہ چھپی ہے۔

ہند ایرانی ادبیات

مصنف: کبیر احمد جائسی

صفحات: 190، قیمت: /250 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، ونگ۔6، آر.کے. پورم، نئی دہلی۔ 110066

مبصر: احمد کفیل، 29 اولڈ، برہم پتر ہاسٹل، جے.این.یو نئی دہلی-110067

پروفیسر کبیر احمد جائسی نے اپنی اس کتاب ''ہند ایرانی ادبیات'' میں ہندوستان اور ایران کے مشترکہ ادبی سرمائے کے چند پہلوؤں پر اپنے مطالعے کا حاصل پیش کیا ہے۔ یہ مطالعے گیارہ موضوعات --- بیدل شخصیت اور ماحول،

خیام: از سید سلیمان ندوی پر ایک نظر، ہند اسلامی تہذیب کے ایرانی اور زردشتی عناصر، دیوانِ حافظِ ہندی، تفسیر القرآن کا فارسی ترجمہ، انشائے مومن پر ایک نظر، ہزارۂ اوّل ہجری میں ایران کی فارسی تفسیر نویسی، جہانگیر اور شاہ عباس کے غیر مطبوعہ خطوط، گلستاں کا باب پنجم، ایران میں آذری زبان کا مسئلہ اور ایران میری نظر میں، پر مشتمل ہیں۔

بیدل ایک ایسا شاعر ہے جس کی شاعری کی سحر آفرینی استادانِ فن کو بھی گرویدہ کر لیتی ہے۔ ان کی تہہ دار شخصیت ان کی شاعری کے علاوہ ''چہار عنصر'' اور ''نکاتِ بیدل'' سے بھی کھل کر سامنے آتی ہے۔ کبیر احمد جائسی نے انھی بنیادی ماخذ سے بیدل کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ مغل بادشاہوں میں شاہ جہاں، فرخ سیر اور محمد شاہ سے بیدل کو عقیدت اور تصوف سے جو والہانہ لگاؤ تھا، اس کے ان کی شاعری پر بھی اثرات رونما ہوئے۔ ''چہار عنصر'' میں بیدل نے اپنے پیرانِ طریقت شاہ قاسم ہواللّہی، شاہ کمال، شاہ ملوک، شاہ کابلی، شاہ یکہ آزاد، شاہ فاضل اور شاہ ابوالفیض کا ذکر کیا ہے جن کے اثر سے وہ اضطراب و اضطرار کی کیفیت سے دوچار ہوئے۔ ان بزرگوں میں خصوصاً شاہ کابلی سے بیدل کو جو تعلقِ خاطر تھا، اس نے بیدل کو ورطۂ حیرت میں غرق کر دیا تھا۔ لیکن کبیر جائسی نے بیدل کے بیشتر پیرانِ طریقت کو بیدل کی خیالی اُپج سے تعبیر کیا ہے۔ ''خیام: از سید سلیمان ندوی پر ایک نظر'' میں جائسی نے سید سلیمان ندوی کی پانچ سو صفحات پر مشتمل کتاب کے حوالے سے خیام کی دوسری حیثیتوں سے قطع نظر صرف ان کی شاعرانہ حیثیت پر نظر ڈالی ہے اور یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ خیام کی رباعیوں کو کس حد تک استناد کا درجہ حاصل ہے۔ اس کی اصل رباعیاں کتنی ہیں اور بعد میں کس طرح اور کتنی رباعیاں ان کے نام سے منسوب کی جاتی رہیں۔

''ہند اسلامی تہذیب کے ایرانی اور زردشتی عناصر'' تہذیبی مطالعے کے لحاظ سے بھی اور لسانی مطالعے کے نقطۂ نظر سے بھی خاصا دلچسپ مضمون ہے۔ اس میں کبیر احمد جائسی نے ہندوستان کی معاشرت، بولیوں، زبانوں، مصوری، موسیقی، ادب اور فنِ تعمیر پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ انھوں نے اردو میں رائج: خدا، ایزد و یزداں، سروش، رستخیز یا رستاخیز، نماز، فرشتہ، اہریمن یا اہرمن اور بہشت و دوزخ کے منبع و ماخذ تک پہنچ کر اس کی تبدیل شدہ صورتوں سے ہمیں روشناس کرایا ہے۔ لفظ ''خدا'' کی تشریح اس طرح کی ہے: ''سب سے پہلے ''خدا'' کا لفظ لیجیے جو ہندوستانی مسلمانوں میں اللہ کے لفظ کے مترادف کے طور پر نہ صرف یہ کہ مستعمل ہے بلکہ اللہ کے لفظ کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ لفظ پہلوی الاصل ہے۔ پہلوی اشکانی میں اس کا تلفظ خوتاذ، پہلوی ساسانی میں خوتای اور پاژند میں خوداے، پہلوی اور پاژند دونوں میں اس لفظ کے معنی بادشاہ کے تھے اور یہ لفظ کبھی بھی اللہ کے معنوں میں استعمال نہ ہوتا تھا۔ یہ لفظ ایرانی اور وسط ایشائی مسلمانوں کے ہمراہ ہندوستان آیا جس سے شہنشاہیت اور بادشاہت کا تصور تو بالکل مفقود ہو گیا اور یہ لفظ صرف اللہ کے لفظ کے مترادف کے طور پر استعمال ہونے لگا۔'' ''دیوانِ حافظِ ہندی'' کے عنوان سے ظاہر ہے کہ یہ حافظ شیراز کا نہیں ہندوستان کا ہے۔ جو تیرھویں صدی ہجری میں غالب، شیفتہ اور صہبائی کا ہمعصر تھا۔ اس کا ایک دیوان ناقص الآخر اور ترقیمہ ندارد، ذاکر حسین لائبریری جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں ہے، کبیر احمد جائسی نے اس کا تحقیقی مطالعہ پیش کیا ہے۔ شاعر کے کلام کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس پر عمر خیام، حافظ شیرازی اور خسرو کا رنگ غالب ہے۔ جائسی نے اردو فارسی تذکروں کی مدد سے دیوان کا سالِ اشاعت اور کلام کی قدر و قیمت کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے۔

''آزاد ہندوستان میں فارسی زبان کے مطالعے کی اہمیت'' میں آٹھ سو سالہ ہندوستانی تاریخ و تہذیب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ سرسید احمد خاں کی تفسیر ''تفسیر القرآن کا فارسی ترجمہ'' جو مشہور ایرانی مترجم سید محمد تقی فخر داعی گیلانی نے کیا ہے اس کا تجزیاتی جائزہ پیش کیا ہے، اور ''انشائے مومن پر ایک نظر'' میں مومن کے فارسی خطوط کی روشنی میں ان کی انشا پردازی کو اجاگر کیا ہے۔ یہ خطوط سب سے پہلے حکیم احسن اللہ خاں نے سلطانی پریس دہلی سے ''انشائے مومن'' کے نام سے شائع کرائے تھے لیکن یہ نسخہ اب نایاب ہے۔ جائسی کے سامنے وہ نسخہ رہا ہے جو پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے مرتب کیا ہے۔ مومن کی ان تحریروں کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ ان میں مومن نے پیش گوئیاں کرتے وقت بڑی دلچسپ باتیں کہی ہیں۔ مثلاً کون سی سماجی برائی کس حد تک بڑھے گی اور اس کے بڑھنے کا انداز کیا ہوگا؟ اس سال جنسی کج روی کا فلاں طریقہ زور پکڑے گا اور یہ کج روی پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔

''ہزارۂ اوّل ہجری میں ایران کی فارسی تفسیر نویسی'' میں محمد بن جریر طبری (م. 310ھ) سے لے کر ملا کمال الدین حسین واعظ کاشفی، معین الدین فراہی ہروی، سید ابوالفتح جرجانی، حجت الاسلام شعرانی اور مولیٰ فتح اللہ کاشانی کے اندازِ تفسیر نویسی کا احاطہ کیا ہے جس میں مطبوعہ تفسیروں کے مقدموں، پروفیسر صفا اور پروفیسر نفیسی کی تاریخ ادبیات، ڈاکٹر موسیٰ دُرودی کی تحقیقِ مفسرانِ پارسی نویس اور اردکانی کی برگزیدہ متونِ فارسی سے بطورِ خاص استفادہ کیا ہے۔ ''جہاں گیر اور شاہ عباس کے غیر مطبوعہ خطوط'' بھی خاصا دلچسپ مضمون ہے۔ شاہانِ صفویہ اور مغلوں کے تعلقات اور ان کے بیچ خط و کتابت کے سلسلے کا ذکر کرتے ہوئے کبیر احمد جائسی نے کئی سوالات بھی قائم کیے ہیں جو خصوصاً تاریخ کے طلبہ کے لیے خاصے دلچسپ ہیں۔

''گلستاں کا باب پنجم'' جو عشق و جوانی کے بیان میں ہے، اس میں شیخ سعدی نے اکیس حکایتیں لکھی ہیں۔ ان حکایتوں میں سولہ حکایتیں مردوں سے عشق کے متعلق ہیں، دو کا تعلق خواتین کے عشق سے ہے اور تین حکایتیں ایسی ہیں جن کا اطلاق عورت اور مرد دونوں پر ہوتا ہے۔ اس مطالعے میں کبیر احمد

جائسی نے اس سوال کا حل ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے کہ سعدی نے انتہائی لطیف پند وموعظمت کے پہلو بہ پہلو اس طرح کے عاشقانہ خیالات کو ان الفاظ میں کیوں تحریر کیا ہے؟

ایران میں آذری زبان کا مسئلہ ایک زمانے سے چلا آرہا ہے۔ دیگر ملکوں کی طرح ایران میں بھی سرکاری زبان فارسی کے علاوہ کئی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان میں ایک آذری ہے جو ترکی النسل ہے یا فارسی النسل؟ یہ اب تک موضوع بحث ہے۔ اس زبان کو ایران میں اب تک سرکاری حیثیت حاصل نہیں۔ کبیر احمد جائسی نے اس کی وجہ دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔

کتاب کے آخر میں ضمیمے کے طور پر ''ایران میری نظر میں'' شامل ہے جس میں کبیر احمد جائسی نے 1977 کے اپنے سفر ایران کا ذکر کیا ہے اور یکم فروری 1977 سے تین فروری تک ''مجلس ملی انجمن استادان فارسی، تہران'' کی جانب سے منعقدہ سہ روزہ سیمینار میں اپنی شرکت کی روداد کے علاوہ انھوں نے جن مقامات کی سیر کی اور تہذیبی ولسانی سطح پر جو تاثرات قائم ہوئے انھیں پرلطف انداز میں پیش کیا ہے۔

کتاب کی طباعت اچھی ہے۔ فہرست اور مقدمے کا التزام نہیں رکھا گیا ہے۔ کونسل کی دوسری مطبوعات کی قیمتوں کو دیکھتے ہوئے اس کتاب کی قیمت زیادہ ہی کہی جائے گی۔

زندگی کا علمی سفر

مصنف: مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی

صفحات: 214، قیمت: -/200 روپے

ناشر: کتب خانہ نعیمیہ دیوبند، یو. پی.

مبصر: ڈاکٹر ابوبکر عباد، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

علمی دنیا میں مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں، کہ یہ تقریباً 52 سال سے دارالعلوم دیوبند جیسے عظیم ادارہ میں فتویٰ نویسی کے کام اور شعبۂ افتا میں درس وتدریس سے منسلک ہیں، اسلامک فقہ اکیڈمی کے صدر، مسلم پرسنل لاء بورڈ کے لیے اسلامی قانون کے مدون، فتاویٰ دارالعلوم کے مرتب، کتب خانہ دارالعلوم دیوبند کے نوادر ومخطوطات کے مؤلف، تقریباً سوا دو سو مضامین ومقالات اور تین درجن سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔

ان کی ایک کتاب کے پیش لفظ میں مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی لکھتے ہیں:

''بڑی خوشی کی بات ہے کہ یہ مشکل اور نازک کام ہمارے فاضل دوست مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی کے سپرد ہوا جو ہر طرح سے اس کے اہل ہیں، ان کی فقہ پر بھی گہری نظر ہے..... وہ متعدد فاضلانہ تصانیف کے مصنف ہیں جو ندوۃ المصنفین جیسے ادارے سے شائع ہوکر مقبول ہوچکی ہیں۔ ان کے ذہن میں اعتدال اور قلم میں احتیاط ہے انھوں نے اس کام کو عالمانہ ومؤرخانہ شان سے انجام دیا اور اس موضوع پر بہت اچھا مواد جمع کردیا ہے۔''

[امارت شرعیہ: دینی جدوجہد کا روشن باب؛ ص-31 سنہ 1974]

اس سال شائع ہونے والی ان کی یہ دوسری کتاب ہے۔ اس سے پہلے ان کے نام مختلف مشاہیر کے خطوط کا مجموعہ ''علمی مراسلے'' کے عنوان سے چھپ کر علمی اور ادبی حلقوں میں قبولیت حاصل کرچکا ہے جس میں سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی، مولانا سعید اکبر آبادی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا عبداللطیف نعمانی، مفتی عتیق الرحمٰن، مفتی کفایت اللہ، مولانا منت اللہ رحمانی اور قاری محمد طیب وغیرہ کے گرانقدر خطوط شامل ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب ''زندگی کا علمی سفر'' دراصل ان کی ضخیم خودنوشت سوانح حیات سے ماخوذ ہے جس کا مسودہ اشاعت سے قبل دارالعلوم کے انقلاب میں ضائع ہوجانے کے بعد شاگردوں کے اصرار پر اور چند معاصرین کی خواہش کے احترام میں مصنف نے اصل کتاب کی تلافی کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس کتاب کی اہمیت صرف یہ نہیں ہے کہ اس کے مطالعے سے ہم ایک عبقری شخصیت کے تحصیل علم کے شوق وجستجو اور ان کے علمی اور ادبی کارناموں سے روشناس ہوتے یا ایک طالب علم کی چھوٹے سے گاؤں کے مکتب سے ایشیا کی سب سے بڑی دینی درسگاہ تک پہنچنے اور وہاں سے عالم اسلام میں شہرت پانے تک کی داستان سے لطف اندوز ہوتے یا حوصلہ پاتے ہیں، بلکہ اس کی اہمیت اس کے اعتبار سے بھی ہے کہ ایک سے زیادہ عہد، ان کے سیاسی اور سماجی حالات، اس عہد کے جید علما، مختلف دینی مدارس کے احوال، ارباب اقتدار کی فہم وفکر، کارکنوں کی ذہنیت، حلقہ بگوشوں کے جوڑ توڑ اور طلبہ کی نفسیات سمجھنے کا بھی موقع ملتا ہے۔ یہ کتاب علما اور مدارس کی اس دنیا سے واقفیت حاصل کرنے میں بھی مدد کرتی ہے جنھیں لوگ دور سے محض ان کے منفی یا مثبت پہلو کو دیکھ کر کوئی رائے قائم کرتے اور ہر دو لحاظ سے کسی طرح کا قرب یا تعلق محسوس کرنے کے بجائے ان کے ساتھ ایک خاص نوع کی اجنبیت کا رشتہ رکھتے ہیں۔

یہ کتاب دارالعلوم دیوبند کے مزاج اور اس کے ایک خاصے متنازعہ فیہ عہد پر بھی روشنی ڈالتی ہے، گو کہ مصنف نے یہاں انتہائی ایجاز واختصار اور احتیاط سے کام لیا ہے، بلکہ کہنا چاہیے کہ ان حقائق کے بیان سے بھی کافی حد تک احتراز کیا ہے جن سے دارالعلوم دیوبند یا علما کے کردار کے مجروح ہونے کا خدشہ تھا۔ کتاب کے شروع میں مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کا تحریر کردہ مصنف کا ایک بے حد شگفتہ، رواں اور جاندار خاکہ بھی بطور پیش لفظ شامل ہے، جس سے مصنف کی شخصیت پوری طرح متور ہوجاتی ہے۔ یہ کتاب علما کے لیے دستاویز، دینی مدارس کے طلبہ کے لیے مشعل راہ اور مذہبی شخصیت سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے قیمتی تحفہ ثابت ہوسکتی ہے۔

اردو ادب کے تین بھائی
مرتب: رفیق جعفر
صفحات: 382، قیمت: -/300 روپے
ناشر: حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ، خان بہادر ہدایت اللہ روڈ، پونے
مبصر: سید امتیاز الدین 3-5-805، حیدر گوڑہ، حیدرآباد-500029

محبوب حسین جگر، ابراہیم جلیس اور مجتبیٰ حسین یہ تین بھائی اردو ادب و صحافت کی ایسی شخصیتیں ہیں کہ جنھیں بجاطور پر قدآور کہا جاسکتا ہے۔ اردو ادب میں ایک ہی خاندان کے باصلاحیت افراد اور بھی گزرے ہیں جیسے بیگ چغتائی اور عصمت چغتائی، سجاد حیدر یلدرم، نذر سجاد حیدر اور قرۃ العین حیدر، کرشن چندر، مہندر ناتھ اور سرلا دیوی، تلوک چند محروم اور جگن ناتھ آزاد، ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور وغیرہ لیکن ایسے خاندانوں پر ایک مبسوط سوانحی کتاب اس سے قبل کم سے کم میری نظر سے نہیں گزری۔ اس کتاب کے محرک منور پیر بھائی ہیں جو حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشنل ٹرسٹ پونے کے چیئرمین ہیں۔ انھیں ایک دن یہ خیال آیا کہ محبوب حسین جگر، ابراہیم جلیس اور مجتبیٰ حسین پر ایک تحقیقی نوعیت کی کتاب تیار کی جائے اور انھوں نے یہ ذمے داری رفیق جعفر صاحب کو سونپی۔ وہ حیدرآبادی ہیں۔ انھیں محبوب حسین جگر کا قرب حاصل رہا ہے اور مجتبیٰ حسین کے تو وہ دوستوں میں سے ہیں۔ رفیق جعفر بہت محنتی آدمی ہیں۔ حیدرآباد، گلبرگہ اور ہر اس مقام پر جہاں سے انھیں معلومات مل سکتی تھیں وہاں گئے۔ لوگوں سے ملے۔ کتابیں، رسائل، اخبارات کے تراشے، لوگوں کے خطوط، تعزیت نامے، گم شدہ مضامین، غرض ہر وہ چیز جو اس کتاب کے لیے ضروری تھی حاصل کی۔

ابراہیم جلیس کے انتقال کو تیس سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ 1948 میں وہ حیدرآباد کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ گئے تھے۔ ان کی کتابیں نایاب ہوگئی ہیں، قریبی احباب میں بہت سے رخصت ہو چکے ہیں۔ ان پر مواد جمع کرنا بہت مشکل تھا لیکن رفیق جعفر نے بڑی محنت سے جلیس کی تحریریں اور ان سے متعلق معلومات اکٹھی کیں۔ محبوب حسین جگر شہرت اور نام و نمود سے دور رہنے والے آدمی تھے۔ ان کے لیے روزنامہ ''سیاست'' ہی سب کچھ تھا۔ جو مضامین اور افسانے انھوں نے لکھے تھے وہ ان کی بے نیازی کی نذر ہوگئے تھے۔ جگر صاحب کے انتقال کو بھی کم و بیش چودہ سال ہو چکے ہیں اگر آج زندہ بھی ہوتے تو رفیق جعفر کی شاید ہی کچھ مدد کرتے۔ بس اتنا کہہ دیتے کہ میاں مجھے پڑھنا ہو تو ''سیاست'' کو پڑھو۔ بہرحال رفیق جعفر نے بڑی محنت سے جگر لخت لخت کو جمع کیا ہے۔ مثلث کا تیسرا ضلع مجتبیٰ حسین ہیں جو ماشاء اللہ زندہ سلامت ہیں۔ لیکن رفیق جعفر کے لیے وہ بھی ایک مشکل مسئلہ تھے جہاں ان کے دو بڑے بھائیوں پر مواد کی کمی ہے وہیں مجتبیٰ حسین پر اتنا کچھ موجود ہے کہ ہر نیا دن ان کی شخصیت کو کچھ اور تابناک کرتا چلا جاتا ہے۔ اب رفیق جعفر کی مشکل یہ تھی کہ اگر ان کے لیے جگر صاحب اور جلیس صاحب کے ذکر خیر کو تھوڑا سا پھیلانا ضروری تھا تو دوسری طرف مجتبیٰ حسین کو سمیٹنا ضروری تھی۔

رفیق جعفر نے تینوں بھائیوں پر مختصر تعارفی نوٹ لکھے ہیں جو کافی دلچسپ ہیں۔ یوسف ناظم اور مجید بیدار کے مضامین بھی دلچسپ ہیں۔ مخدوم اور شکیلہ بانو بھوپالی پر جگر صاحب کے مضامین تبرک کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کی غزل پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ جگر صاحب میں شعرگوئی کی صلاحیت بھی تھی لیکن انھوں نے اپنی تمام صلاحیتوں کو صحافت کے لیے وقف کر دیا۔

گوشۂ ابراہیم جلیس میں رفیق جعفر نے مختلف مضامین، لطیفے، خطوط انٹرویو، ابراہیم جلیس کی آخری تحریر، پہلی تحریر، غرض تلاش و جستجو سے جتنا کچھ حاصل ہوسکتا تھا، سلیقے سے پیش کر دیا ہے۔

مجتبیٰ حسین کا گوشہ کتاب کے تقریباً ایک سو ساٹھ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اللہ یوسف ناظم کی عمر دراز کرے اور ان کے قلم کی رفتار میں کمی نہ ہو۔ انھوں نے تینوں بھائیوں پر مضامین لکھے ہیں۔ شوکت تھانوی نے کسی شاعر کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کے والد محترم سے بھی ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ اس شاعر نے شوکت تھانوی سے دوٹوک لفظوں میں کہہ دیا کہ مجھے یہ بالکل پسند نہیں کہ آپ مجھ سے بھی بے تکلف رہیں اور میرے والد سے بھی۔ آپ کو دوستی کے لیے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ بہرحال یوسف ناظم کی تینوں بھائیوں سے دوستی رفیق جعفر کے بہت کام آئی۔ مجتبیٰ حسین کا گوشہ اس کتاب کا سب سے جاندار گوشہ ہے۔

رفیق جعفر نے اس کتاب کو نہایت محنت سے ترتیب دیا ہے۔ خود ان کی اتنی تحریریں اس میں شامل ہیں کہ اسے بجاطور پر تالیف کے ساتھ ساتھ تصنیف بھی کہا جاسکتا ہے۔

بحث و مباحثہ جلد-1، شمارہ-4
مدیر: آصف اعظمی
صفحات: 143، قیمت: -/50 روپے
ناشر: بحث و مباحثہ، A-266، پاکٹ-2، میور وہار، فیز-1، دہلی-110091
مبصر: خلیق انجم، جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی-2

اردو جرنلزم کے بارے میں اہل اردو کی ایک رائے یہ بھی ہے کہ یہ روبہ زوال ہے۔ جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ملک آزاد ہونے کے وقت اردو اخباروں اور رسالوں کی تعداد پانچ سو ساڑھے پانچ سو کے درمیان تھی اور اب یہ تعداد بڑھ کر ستائیس سو سے اوپر پہنچ چکی ہے۔ ملک کی مختلف زبانوں میں شائع ہونے والے اخباروں اور رسالوں میں اردو اخبار اور رسائل چھٹے نمبر پر ہیں۔ یہ شکایت بھی عام ہے کہ اردو اخبار والے اپنی تعداد اشاعت بڑھ چڑھ کر بتاتے ہیں۔ یہ شکایت صرف اردو کے اخباروں کے خلاف ہی نہیں بلکہ

ہندوستان کی تمام زبانوں کے اخباروں اور رسالوں کے بارے میں بھی یہ بات عام طور پر کہی جاتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اردو اخباروں اور رسالوں کی حالت ناگفتہ بہ نہیں ہے۔

اردو جرنلزم کی تسلی بخش حالت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ سال دو سال کے وقفے سے نئے نئے اردو اخبار اور رسائل جاری ہوتے ہیں۔ بڑی بات یہ ہے کہ یہ اخبارات اور رسالے خود اپنے بل پر زندہ رہتے ہیں۔ ان اخباروں کی طباعت کا معیار بھی دوسری زبانوں کے اخباروں اور رسالوں سے کسی طرح کم نہیں ہوتا۔

ہندوستان میں اردو پڑھنے، لکھنے اور بولنے والوں کی تعداد مردم شماری کے مطابق چار کروڑ سے زیادہ ہے۔ اگر اہلِ اردو یہ فیصلہ کرلیں کہ اخبار خرید کر پڑھیں گے تو اردو اخبارات اور رسائل کا مستقبل انتہائی روشن اور تابناک ہوسکتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ چالیس سال کے بعد فن کار کے قلم کی روشنائی سوکھ جاتی ہے یا ماند پڑ جاتی ہے۔ یہی حال ترقی پسند مصنفین کا ہوا۔ جس تحریک نے کئی سو سال سے اردو ادب پر جمی ہوئی گرد کو صاف کرنے کا عمل شروع کیا اور 1936 میں اردو والوں کے فکری رویوں، ادبی رجحانوں اور روایتوں کو عصری زندگی سے ہم آہنگ کرنا شروع کیا اور جو کامیابی کے ساتھ ادب کو عام آدمی کی زندگی کے قریب لائی، وہ خود ایک طرح کی فرسودگی کا شکار ہوگئی اور اس کا وہی حشر ہوا جو ہر ادب کی تاریخ میں اکثر ایسی تحریکوں کا ہو چکا ہے۔ ترقی پسند تحریک کی خوش نصیبی ہے کہ اس کے بہت سے سینئر مصنفین ابھی تک عملی طور پر فعال ہیں۔ نیز یہ بھی خوشی کی بات ہے کہ نئی نسل کے کچھ ترقی پسند مصنفوں نے ادب کی نئی راہوں کو تلاش کرنے کی جدوجہد شروع کردی ہے جو اس بات کا اشارہ ہے کہ اردو ادب ہر طرح کے کلیشے کی گرفت سے اپنے آپ کو آزاد کرلے گا۔ جدیدیت نے مختلف الخیال ذہن کے ادیبوں کو اپنی طرف متوجہ کیا جن میں ترقی پسندی کے مخالف بھی طرح کے لوگ شامل تھے۔ کسی بھی طرح کی نظریاتی بحث میں پڑے بغیر جدیدیت کے بارے میں اتنا تو کہا جاسکتا ہے کہ اس صورت حال نے ادب میں ایک کھلی فضا کو جنم دیا اور تازہ کاری کے نئے نئے امکانات روشن ہوئے۔ اردو میں ترقی اور فروغ کے امکانات کو تلاش کرنے کے لیے جو ایک نئی نسل سامنے آئی ہے۔ اس نسل کے خلاف یا اسے برا بھلا کہنے کے بجائے ضروری ہے کہ پرانی نسل اس نسل کی حوصلہ افزائی کرے۔ اس نسل۔ اس نسل کو پرانی نسل کی حوصلہ افزائی کی ضرورت نہ بھی سہی پھر بھی اس نسل کی حوصلہ افزائی اردو ادب کی ترقی اور فروغ کی ضامن ضرور ہوگی۔

اس وقت میرے پیشِ نظر ''بحث ومباحثہ'' کی پہلی جلد کا چوتھا شمارہ ہے۔ اس رسالے کی مجلسِ ادارت میں نئی نسل کے ذہین لکھنے والوں کے نام دیکھنے کو ملے جن میں شاہد پرویز، ارجمند آرا، چمن لال، افشاں رحمٰن، ندیم ماہر، جمیل منظر کے نام شامل ہیں۔ رسالے کے مدیر آصف اعظمی اور معاون مدیر عزیز نبیل ہیں۔ موجودہ شمارے میں پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی کا ''مخدوم محی الدین کی شاعری'' پر ایک مقالہ ہے۔ انھوں نے مخدوم کی شاعری کو مختلف پہلوؤں سے دیکھا ہے۔ اس رسالے میں صدیق الرحمٰن قدوائی صاحب کے اس مقالے کی شمولیت اس بات کا ثبوت ہے کہ نئی نسل ترقی پسند ادب اور اس کے موجودہ نقادوں کے خلاف نہیں اور یہ بھی کہ وہ پرانی اور نئی نسل کے امتیاز سے اوپر اٹھ کر سوچتی ہے۔ یہ ایک خوش آئند بات ہے۔

پروفیسر لطف الرحمٰن ہمارے اعلا درجے کے نقادوں میں ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ مقبولیت اور شہرت حاصل کرنے کے لیے جو طریقے اختیار کیے جاتے ہیں وہ ان سے کوسوں دور ہیں۔ اس کے باوجود ادب کا صاحب رائے حلقہ ان کے کاموں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

جاوید رحمانی نے مدلل طریقے سے یہ ثابت کیا ہے کہ پریم چند اپنی عمر کے آخری زمانے میں خود کو ہندی کا ادیب سمجھنے لگے تھے۔ رحمانی صاحب نے بتایا ہے کہ پریم چند کے زمانے میں ایک ادبی رسالہ تھا ''سرسوتی'' جس کے مدیر مہاویر پرساد دویدی تھے۔ دویدی صاحب کی حالت یہ تھی کہ مصنف جیسی بھی تحریر ان کو بھیجتے وہ اسے اپنی مفروضہ جدید ہندی کے سانچے میں ڈھال دیا کرتے تھے۔ پریم چند نے اپنی کئی تحریریں اس رسالے کو بھیجی تھیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہندی اور اردو نے جو فرقہ وارانہ رنگ اختیار کیا تھا بقول جاوید رحمانی ''پریم چند بھی اس کا شکار نظر آتے ہیں۔''

رحمانی صاحب کے بارے میں، میں عرض کروں گا کہ وہ ایک ذہین ادیب ہیں۔ ان کی تحریریں ادبی بصیرت کی حامل ہوتی ہیں اور شاید وہ دن دور نہیں جب ان کا شمار اردو کے قابلِ ذکر لکھنے والوں اور دانشوروں میں ہوگا۔

ارجمند آرا نے اقلیتوں کے مسائل کا تجزیہ نہایت ایمان داری اور غیر جانب دارانہ انداز میں کیا ہے۔ مضامین کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اقلیتی طبقے کے سیاسی اور سماجی مسائل پر ان کی گہری نظر ہے۔ اس کے علاوہ وہ ایک لائق مترجم کی حیثیت سے بھی اپنی صلاحیتوں کا ثبوت بہم پہنچا رہی ہیں۔

ابوبکر عباد کا مضمون ''بنگال: نشاۃ الثانیہ اور اردو'' بھی اس شمارے میں شامل ہے۔ انھوں نے مختصر سے مقالے میں اس موضوع کے ساتھ پورا انصاف کیا ہے۔ مصطفیٰ زیدی کا مقالہ ''اپنا دیوان بغل میں داب کے میر'' کا بھی اچھے مضامین میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

''بحث ومباحثہ'' کے اس شمارے میں اردو کے کہنہ مشق شاعر اور نثر نگار مخمور سعیدی کے سوانح کی بھی پہلی قسط ''سلسلۂ روز وشب'' کے عنوان سے شائع ہوئی ہے جس میں دہلی کی اس زندگی اور تہذیب کا بیان ہے جو خود میری زندگی کا بیش بہا حصہ ہے۔ مخمور صاحب نے اپنی زندگی کے حالات بیان کی اور

سچائی کے ساتھ بیان کیے ہیں۔

غرض یہ کہ ''بحث و مباحثہ'' کے تمام مضامین اور شعری حصہ اردو ادب کے ایسے اعلیٰ نمونے ہیں جن میں تازگی بھی ہے اور توانائی بھی۔ نئی نسل کے باہنر لکھنے والوں کی جتنی بھی حوصلہ افزائی اور پذیرائی کی جائے وہ کم ہے، اس لیے کہ اردو ادب کے تابناک مستقبل کی ضمانت یہی لوگ ہیں۔ طباعت کے لحاظ سے بھی یہ رسالہ صاف ستھرا اور دیدہ زیب ہے۔

گیسوئے تنقید (ادبی مضامین)

مصنف: ڈاکٹر امام اعظم

صفحات: 176، قیمت: -/200 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی-110006

مبصر: ڈاکٹر فیروز عالم، لکچرر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

ڈاکٹر امام اعظم سہ ماہی ''تمثیل نو'' (دربھنگہ) کے مدیر، ایک شاعر اور نقاد کی حیثیت سے دنیائے علم و ادب میں اپنی شناخت بنا چکے ہیں۔ شاعری، تنقید، تحقیق اور ترجمے کے میدان میں اب تک ان کی کوئی درجن بھر کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ''گیسوئے تنقید'' حال ہی میں منظر عام پر آئی ہے جس میں مختلف موضوعات پر مبنی مضامین شامل ہیں۔ یہ مضامین مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔

''گیسوئے تنقید'' کا پہلا مضمون ''ہندوستانی تعلیم کے معمار: مولانا ابوالکلام آزاد'' ہے۔ اس میں مصنف نے تعلیم کے شعبے میں مولانا آزاد کی خدمات سے واقف کرایا ہے۔ تحریک آزادی میں مولانا آزاد کی نمایاں کارکردگی سے تو سب واقف ہیں لیکن کم لوگ جانتے ہیں کہ آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم کی حیثیت سے انھوں نے کتنی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن، انڈین کونسل فار ایگریکلچر سائنٹفک ریسرچ، انڈین کونسل فار میڈیکل ریسرچ، انڈین کونسل فار سوشل سائنس ریسرچ، انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز، اسکول آف انٹرنیشنل اسٹڈیز، ساہتیہ اکادمی، للت کلا اکادمی اور سنگیت ناٹک اکادمی جیسے اداروں کے بنیاد گزار مولانا آزاد ہی تھے۔ یہ تمام ادارے آج ملک کی تعمیر و ترقی میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔

اس کتاب کا ایک اہم مضمون ''ساختیات اور اسلوب کے تناظر میں نارنگ کا سفر تنقید'' ہے۔ اس میں مصنف نے ساختیاتی اور اسلوبیاتی تنقید کا مختصر تعارف پیش کرتے ہوئے اس ضمن میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کی خدمات کا جائزہ لیا ہے ''مظہر امام کی خاکہ نگاری'' ایک طویل مضمون ہے جس میں ڈاکٹر امام اعظم نے خاکہ نگاری کا مختصر تعارف کرانے کے بعد اس کے فنی اصولوں کی روشنی میں مظہر امام کے خاکوں کے مجموعے ''اکثر یاد آتے ہیں'' کا تفصیلی تجزیہ کیا ہے۔ مصنف نے ان خاکوں کی خوبیوں اور خامیوں پر نظر ڈالنے کے ساتھ مظہر امام کی خاکہ نگاری سے متعلق دیگر اہل قلم کی آرا بھی پیش کی ہیں۔

عصر حاضر میں شکیل الرحمٰن ایسے نقاد ہیں جنھوں نے خود کو ادب کے جمالیاتی مطالعے کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ امیر خسرو کی جمالیات، مرزا غالب اور ہند مغل جمالیات، غالب کی جمالیات اور مغل مصوری، تصوف کی جمالیات، ہندوستان کا نظام جمال، قرآن حکیم۔ جمالیات کا سرچشمہ، اور مولانا رومی کی جمالیات، ان کی اہم تصانیف ہیں۔ ڈاکٹر امام اعظم نے آخرالذکر کتاب کی روشنی میں شکیل الرحمٰن کی تنقیدی بصیرت پر روشنی ڈالی ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ''شکیل الرحمٰن دور حاضر میں مولانا رومی کی طرح خود ان تجربوں سے گزرے ہیں اور ہمارے سامنے عشق، تصوف اور جمالیات کے رشتوں کو اجاگر کیا ہے۔'' ''اردو تنقید میں وہاب اشرفی کی انفرادیت'' بھی ایک قابل قدر مضمون ہے جس میں وہاب اشرفی کے تنقیدی رویے، تنقیدی طریقۂ کار، تنقیدی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان کے تنقیدی طریقۂ کار کے بارے میں امام اعظم لکھتے ہیں:

''وہاب اشرفی نے ادب کو محض میکانکی یا پارمیکانکی عمل نہیں سمجھا بلکہ اس سے اوپر اٹھ کر ذہنی سطح کی ان باریک منزلوں کو بھی عبور کرنے کی کوشش کی ہے جو کسی فن پارے کے محرکات و عوامل ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ Content پر اتنا زور نہیں دیتے بلکہ اس کے ٹریٹمنٹ، اس کی پیش کش، اس کے ظاہری خدوخال اور اس کی اپیل پر پوری توجہ مرکوز کرتے ہیں۔'' راسخ کے کلام میں تصوف، معنوی قوس و قزح کا شاعر: فضا ابن فیضی، غیاث احمد گدی کی فنکارانہ انفرادیت، کشکول کا المیہ، جنم کنڈلی (فہیم اعظمی کے ناول کا تنقیدی جائزہ)، متھلا میں اردو صحافت اور بہار کے کالجوں میں اردو تعلیم کے مسائل، اس کتاب کے دیگر اہم مضامین ہیں۔

ڈاکٹر امام اعظم کا مطالعہ وسیع ہے اور شاعری کے ساتھ ساتھ فکشن پر بھی ان کی نظر ہے۔ وہ خوبیوں کے ساتھ ساتھ خامیاں بھی اجاگر کرتے ہیں اور بیباکی سے اپنی رائے پیش کرتے ہیں۔ امید ہے کہ شائقین ادب اس کتاب کی پذیرائی کریں گے۔

تانیثیت کے مباحث اور اردو ناول

مصنف: ڈاکٹر شبنم آرا

صفحات: 265، قیمت: -/150 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی-110006

مبصر: ڈاکٹر مشرف علی، لکچرر شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی

اس کتاب میں تانیثیت کے قومی اور بین الاقوامی پس منظر، آغاز و ارتقا اور اردو ناول میں تانیثی تحریک کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ انسانی زندگی میں سیاسی، سماجی، تہذیبی اور معاشی تبدیلیوں کی کارفرمائی ہر جگہ موجود ہے۔ ادب کو بھی مختلف سیاسی و سماجی تحریکات نے متاثر کیا ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے

بعد اور خصوصاً یوروپ میں صنعتی انقلاب سے پیدا شدہ حالات و مسائل کے تحت فرد کی آزادی، انصاف و مساوات اور ذات کی شناخت کے ساتھ ساتھ عورتوں کے حقوق کے سوالات منظر عام پر آئے۔

شعبۂ ہائے زندگی میں عورتوں کے حقوق کے تعلق سے پہلی بار امریکا اور برطانیہ کے مفکروں اور دانشوروں نے باضابطہ طور پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور پدرسری سماج میں عورتوں کی سماجی حیثیت کو موضوع بحث بنایا۔ بہت جلد اس بحث نے ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی جو پوری دنیا میں پھیل گئی جسے آج ہم ''تانیثی تحریک'' کے نام سے جانتے ہیں۔ تانیثیت کے مختلف تصورات اور نظریات کے مطالعے سے ایک بات واضح طور پر ابھر کر سامنے آتی ہے کہ اس کا بنیادی مقصد سماج میں عورتوں کے حقوق کے لیے آواز بلند کرنا ہے تاہم تانیثیت کی ابھی تک کوئی جامع اور حتمی تعریف متعین نہیں ہو سکی ہے۔ انسائیکلو پیڈیا آف سوشیالوجی میں تانیثیت کی تعریف یوں کی گئی ہے:

"Feminism: a movement that attempts to institute social, economic and political equality between men and women in society and distortion in the relationship between men and women."

تانیثیت کی مندرجۂ بالا تعریف سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس کا بنیادی مقصد زندگی کے مختلف شعبوں میں مرد اور عورت کے مابین موجود امتیازات کو ختم کرنا اور عورتوں کی سماجی حیثیت کو بہتر بنانا ہے۔

زیر نظر کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں مصنفہ نے ''تانیثیت کیا ہے؟'' کے عنوان کے تحت تانیثی تحریک کے اغراض و مقاصد اور اس کے مفہوم کو مختلف تصورات و نظریات کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ دوسرا باب ''تانیثیت کا بین الاقوامی تناظر'' ہے۔ اس باب میں عالمی سطح پر عورتوں کی حیثیت سے گفتگو کرتے ہوئے تانیثی تحریک کے اسباب و علل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تانیثی تحریک کو بین الاقوامی تناظر میں سمجھنے میں یہ باب معاون ہے۔

تیسرا باب ''تانیثیت کا قومی تناظر'' ہے۔ اس باب میں ہندوستانی سماج میں ویدک عہد سے لے کر عصر حاضر تک عورتوں کی سماجی حیثیت کو تاریخ کی روشنی میں اجاگر کیا گیا ہے اور ہندوستان میں تانیثی تحریک کے ارتقا پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

چوتھے باب کا عنوان ''اردو ادب میں تانیثیت کی روایت'' ہے جس میں وضاحت کی گئی ہے کہ اردو ادب میں تانیثی تحریک منظم شکل میں موجود نہیں تھی تاہم دانشوران قوم و ملت اور ادیبوں اور شاعروں نے عورتوں کی سماجی حیثیت کو بہتر بنانے اور سماج میں ان کے مثبت کردار کو اجاگر کرنے کے لیے کئی اہم کارنامے انجام دیے ہیں اور پدرسری سماج میں عورتوں کے سماجی، سیاسی، مذہبی اور معاشی استحصال کو نہ صرف موضوع بحث بنایا ہے بلکہ اصلاح کا ٹھوس لائحہ عمل بھی پیش کیا ہے۔

پانچویں باب کا موضوع ''اردو فکشن پر تانیثیت کے اثرات (انگارے سے قبل)'' ہے۔ اس باب میں مصنفہ نے ''انگارے'' کی اشاعت سے قبل اردو فکشن میں عورتوں کے حالات و مسائل کا تجزیہ تانیثی نقطۂ نظر سے کیا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اردو فکشن پر تانیثیت کے اثرات 1932 سے قبل براہ راست نہ سہی لیکن بلواسطہ طور پر موجود رہے ہیں۔ چھٹے باب کا موضوع ''انگارے اور تانیثیت'' ہے۔ ''انگارے'' میں شامل افسانوں کا براہ راست تانیثی تحریک سے کوئی تعلق نہیں ہے تاہم اس مجموعے میں شامل افسانوں میں اس عہد کے فرسودہ رسم و رواج، عورتوں کے گوناگوں حالات و مسائل اور جنسی جبر کو بے باکی اور جرأت مندی کے ساتھ ہدف تنقید بنایا گیا ہے۔ اس باب کے تحت مصنفہ نے ''دلاری''، ''بادل نہیں آتے''، ''جواں مردی'' اور پردے کے پیچھے (ڈراما) کا تجزیہ تانیثی نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ان میں تانیثی افکار بالواسطہ طور پر موجود ہیں۔

ساتویں اور آخری باب کا موضوع ''اردو ناول اور تانیثیت'' ہے۔ اس باب کے تحت عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، خدیجہ مستور، جمیلہ ہاشمی، رضیہ فصیح احمد، جیلانی بانو، بانو قدسیہ اور صغرا مہدی کے ناولوں میں پیش کیے گئے عورتوں کے مختلف کرداروں، سماجی زندگی میں ان کی جدوجہد اور زندگی کے ہر شعبے میں مردوں کے شانہ بشانہ ان کے عملی کارناموں کا تجزیہ تانیثی افکار کے تحت کیا گیا ہے۔

مصنفہ نے تانیثی تصورات و نظریات اور افکار کے خصوصی مطالعے کے لیے صرف خواتین ناول نگاروں پر اکتفا کیا ہے جب کہ کتاب کا عنوان ''تانیثیت کے مباحث اور اردو ناول'' ہے۔ اگر ہم اردو ناول کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو آغاز سے ہی ناول نگاروں (خواہ وہ مرد ہوں یا عورت) نے عورتوں کی سماجی حیثیت اور ان کے مسائل کو موضوع بحث بنایا ہے۔ عصر حاضر کے دو ناولوں فائر ایریا (الیاس احمد گدی) اور مکان (پیغام آفاقی) کا ذکر یہاں بے جا نہ ہوگا کیوں کہ ''فائر ایریا'' میں ختونیا کا کردار اور ''مکان'' کی نیرا کا کردار تانیثی افکار و نظریات کے لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے۔

مجموعی طور پر یہ کتاب تانیثیت کے بین الاقوامی اور قومی تناظر، آغاز و ارتقا، اغراض و مقاصد اور اردو ادب خصوصاً اردو فکشن پر اس کے اثرات کے مطالعے کی سمت میں ایک اہم پیش رفت ہے۔ امید ہے اس کتاب کو قارئین کی پذیرائی حاصل ہوگی۔

□□□

محمد سراج عظیم

ہندوستان کی پہلی خاتون ڈاکٹر

یہ ایک غریب مگر باہمت لڑکی کی کہانی ہے، جس نے اپنی محنت، لگن، ہمت اور مستقل مزاجی سے ایسا کارنامہ انجام دیا جو ہم سب کے لیے ہمیشہ مشعلِ راہ رہے گا۔ یہ لڑکی مہاراشٹر کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں 1861 میں پیدا ہوئی۔ ماں باپ نے اس کا نام جمنا رکھا۔ 1874 میں جمنا جب صرف تیرہ برس کی تھی تب اس کی شادی محکمۂ ڈاک میں کام کرنے والے ایک کلرک سے ہوگئی۔ اس کے شوہر کا نام گوپال راؤ جوشی تھا۔ جب جمنا اپنی سسرال پہنچی تو اس کے شوہر نے اس کا نام آنندی بائی رکھ دیا۔ آنندی بائی بہت محنتی اور سمجھدار لڑکی تھی مگر ان پڑھ تھی۔ گوپال راؤ کو آنندی کے ان پڑھ ہونے کا بہت دکھ ہوتا تھا وہ ہر وقت اس کوشش میں رہتا کہ آنندی کسی طرح سے پڑھ لکھ جائے۔ آخر ایک دن اپنی اسی سوچ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وہ انگریزی، ہندی اور مراٹھی کی چھوٹی چھوٹی کتابیں خرید کر لایا اور آنندی بائی کو دیں۔

گوپال راؤ جوشی نے ایک دن باقاعدہ آنندی کو پڑھانا شروع کیا۔ وہ جب اپنے کام سے شام کو واپس آتا تو رات کا کھانا کھا کر لالٹین کے سامنے بیٹھ کر آنندی بائی کو پڑھنا، لکھنا سکھاتا۔ آنندی اپنے ہم عمر بچوں سے کہیں زیادہ ذہین تھی۔ اس نے بہت جلدی پڑھنا اور لکھنا سیکھ لیا۔

آنندی ابھی چودہ برس کی ہی ہوئی تھی کہ ایک بیٹے کی ماں بن گئی۔ پیدائش کے کچھ دن بعد اس کا بیٹا بیمار پڑ گیا۔ گوپال اور آنندی اپنی غریبی کی وجہ سے اپنے بیٹے کو کسی اچھے ڈاکٹر کو نہیں دکھا سکے۔ ان کا بیٹا ایک مہینے کا بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ اس کا انتقال ہوگیا۔ بچے کی موت سے آنندی بائی بہت دل برداشتہ ہوئی۔ وہ گم صم رہنے لگی، گوپال راؤ بھی بہت افسردہ رہنے لگا۔ اس حادثے نے دونوں کی زندگی پر گہرا اثر چھوڑا۔ ان کو رہ رہ کر اپنی غریبی پر رونا آتا تھا کہ وہ اس قابل بھی نہیں تھے کہ اپنے بچے کا شہر جاکر ڈاکٹر سے علاج کرا سکتے۔ نہ ہی علاقے میں کوئی ایسا ڈاکٹر تھا جو مفت علاج کرتا۔ آنندی بائی کو بیٹے کی موت کے غم نے بہت سی سوچوں میں ڈبو دیا تھا۔ وہ سوچتی تھی کہ ہم عورتیں صرف گھروں میں کام کرنے اور گھروں کی چار دیواریوں میں رہنے یا کھیتوں پر کام کرنے کے علاوہ کچھ اور کیوں نہیں کرسکتیں جس سے اپنا بھی بھلا ہو اور دوسروں کا

بھی۔ کیا ہم وہ کام نہیں کرسکتی ہیں جو مرد کرتے ہیں۔ آنندی کو اس بات کا گہرا صدمہ تھا کہ علاقے میں گنے چنے ڈاکٹر تھے اور ان میں سے ایک بھی خاتون ڈاکٹر نہیں تھی۔ تبھی اس نے ایک اہم فیصلہ کیا کہ وہ خود ڈاکٹر بنے گی اور اپنے گاؤں اور اپنے ملک کی خدمت کرے گی تا کہ اس کی طرح اب کوئی اور ماں ڈاکٹر کی کمی اور غربت کی وجہ سے اپنے بچے کو نہ گنوادے۔ اس زمانے میں گاؤں کی کسی عورت کا پڑھنا لکھنا معیوب سمجھا جاتا تھا اور پھر ڈاکٹر بننے کے بارے میں سوچنے کا مطلب جوئے شیر لانے کے برابر تھا۔ لوگوں نے آنندی کا بڑا مذاق اڑایا، برا بھلا کہا لیکن وہ ارادے کی مضبوط لڑکی تھی، اپنے فیصلے پر ثابت قدمی سے جمی رہی۔ اس کا شوہر گوپال راؤ جوشی بھی اس کی ہمت افزائی کرتا رہا۔ اس کو بھی گاؤں والے برا بھلا کہتے لیکن وہ پرواہ نہ کرتا۔ آنندی چپ چاپ محنت اور لگن کے ساتھ اپنی پڑھائی میں لگی رہی۔

اسی درمیان ایک امریکی خاتون ہندوستان آئی۔ اس کا نام مسز کارپینٹر (Mrs. Carpenter) تھا۔ اس کے ہندوستان قیام کے دوران ایک دن اتفاق سے اس کو آنندی کے بارے میں معلوم ہوا، وہ آنندی سے مل کر بہت خوش ہوئی۔ اس کو جب معلوم ہوا کہ آنندی ڈاکٹر بننا چاہتی ہے تب تو اس کی خوشی کی انتہا نہیں رہی۔ اس نے آنندی کو امریکا آنے کی دعوت دی۔ مسز کارپینٹر نے آنندی بائی کا ہندوستان سے امریکا تک کا جہاز کا کرایہ، وہاں رہنے کھانے اور پڑھائی کا تمام خرچ خود کیا۔ آنندی کی خوشی کی انتہا نہ تھی لیکن اپنے عزیز اور محبت کرنے والے شوہر سے الگ ہو کر تنہا امریکا ہزاروں میل دور جانے کے تصور نے اس کو مغموم کر رکھا تھا۔ مسز کارپینٹر نے آنندی کو سمجھایا اور ڈھارس بندھائی کہ بس کچھ دنوں اپنے ملک اور شوہر سے الگ رہنے کے بعد تم ایک ڈاکٹر بن جاؤ گی۔ پھر تم اپنے ملک اور اپنے شوہر کے لیے عزت وافتخار کا نشان ہوگی۔ کارپینٹر نے گوپال راؤ کی بھی ہمت بندھائی اور اس کو آنندی کا پورا خیال رکھنے اور اس کی مدد کرنے کا یقین دلایا۔

آخر ایک دن آنندی پانی کے جہاز سے بحرالکاہل کے وسیع وعریض سمندر میں امریکا کے لیے روانہ ہوگئی۔ اس سفر میں اس کا شوہر اس کے ساتھ نہیں تھا۔ اس نے اپنے شوہر اور ملک کی یادوں کے ساتھ تن تنہا جہاز سے بحرالکاہل کے طویل سفر کو طے کیا اور امریکا پہنچ گئی۔ وہاں پہنچ کر اس نے مسز کارپینٹر کی مدد سے امریکا کے چند بہترین کالجوں میں سے ایک ویمنس میڈیکل کالج آف پین سلوینیا (Women's Medical Collage of Pennsylvania) میں ڈاکٹری کے کورس ایم بی بی ایس (MBBS) میں داخلہ لے لیا۔ یہاں بھی آنندی بائی اپنی پڑھائی میں پوری لگن اور محنت کے ساتھ لگی رہی۔ اس

درمیان میں وہ اور گوپال راؤ جوشی ایک دوسرے کے خطوں کے ذریعے اپنی حالت سے مطلع کرتے رہے اور ایک دوسرے کی ہمت بندھاتے رہے۔

آخر کار ایک دن وہ آیا جب اس کی ڈاکٹری کی تعلیم مکمل ہوگئی، اس کا خواب پورا ہوگیا، وہ بہت خوش تھی۔ گوپال راؤ جوشی بھی خوشی اور فخر سے پھولے نہیں سماتا تھا۔ آنندی ابھی تک اپنے بیٹے کو بھول نہیں سکی تھی۔ وہ سوچتی تھی کہ میری طرح کتنی مائیں ہوں گی جو اپنی غریبی کی وجہ سے اپنے بچوں کو ڈاکٹر کے پاس نہیں لے جاسکتی ہوں گی اور ان کی گود سونی ہوگی۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ اپنے ملک جاکر اپنے گاؤں کے لوگوں اور غریب عوام کی خدمت کرے گی۔

آنندی بائی نے مارچ 1886 میں اپنی تعلیم مکمل کی۔ اسی سال اس نے پھر پانی کے جہاز سے اپنے ملک کی واپسی کا سفر اختیار کیا۔ اس نے اپنی لگن اور مصمم ارادے کے ساتھ غیر ممکن کو ممکن کر دکھایا تھا اور اب خوش وخرم واپس اپنے ملک اپنے گاؤں کے لوگوں اور اپنے شوہر کے پاس جارہی تھی۔ جب وہ امریکا کے سفر پر جارہی تھی تو اس کے گاؤں والوں نے اس کا بڑا مذاق اڑایا تھا، اس کے خلاف بہت گندی اور سخت باتیں کہی تھیں۔ لیکن جب وہ ڈاکٹر بن کر واپس لوٹی تو سب کی زبان پر اس کی تعریف کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ انھوں نے اپنے گاؤں کی بہو کا گرم جوشی سے استقبال کیا۔ کیونکہ اس نے ان کا اور گاؤں کا سر فخر سے بلند کردیا تھا۔ اب لوگ اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اس کی عزت کرتے تھے۔ اس نے آنے والی نسلوں کے لیے ایک مثال قائم کی تھی، اس نے ثابت کردیا تھا کہ اگر سچی لگن ہو اور محنت کی جائے تو کوئی بھی کام دشوار نہیں ہے۔ بس انسان کو مضبوط قوت ارادی کا مالک ہونا چاہیے۔ وہ ہندوستان کی سب سے پہلی خاتون ڈاکٹر تھی۔

افسوس کہ آنندی بائی اپنے گاؤں کے لوگوں اور ملک کی خدمت نہیں کرسکی کیوں کہ امریکا سے واپسی کے چند مہینوں بعد ہی پچیس سال کی عمر میں اس کو ٹی بی کا عارضہ ہوا اور اس کا انتقال ہوگیا، مگر اس طرح ایک غیر معروف گاؤں کی غریب لڑکی نے ہندوستان کی تاریخ میں اپنا نام درج کرالیا اور آنے والی نسلوں کے لیے ایک روشن مثال قائم کردی۔

❑❑❑

پتہ:
A-47, Zakir Bagh,
Okhla Road,
New Delhi-110025

کتب فروشوں اور ادب کے قارئین کے لیے خوشخبری
قومی اردو کونسل کی مندرجہ ذیل مطبوعات 75 فیصد کمیشن پر طلب کی جاسکتی ہیں
اپنی ضرورت کی کتابوں کا آرڈر آج ہی بھجوائیں

نمبر شمار	کتاب کا نام	قیمت اصل	قیمت مابعد رعایت 75%
01	آزادی	52.00	13.00
02	آزادی کے بعد سائنس اور ٹیکنالوجی	123.00	31.00
03	افغانستان میں جدید دری فارسی شاعری	80.00	20.00
04	عہد ناظم کتب خانہ داری ایک تعارف	55.00	14.00
05	علی وردی اور اس کا عہد	86.00	22.00
06	عشری درجہ بندی	167.00	42.00
07	آڈیٹنگ کے بنیادی اصول	331.00	83.00
08	برقی توانائی	94.00	24.00
09	بھارت 2001	250.00	63.00
10	بھارت 2002	250.00	63.00
11	چولا راجگان	209.00	52.00
12	ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا: حیات اور کارنامے	69.00	17.00
13	فلسفیانہ تجزیہ: ایک تعارف	120.00	30.00
14	فیودر دستوئیفسکی	52.00	13.00
15	غرائب الجمل	76.00	19.00
16	گلشنِ بے خار	128.00	32.00
17	ہمارا قدیم سماج	54.00	14.00
18	ہندوستان کی خارجہ پالیسی کی بنیادیں	33.00	08.00
19	ہندوستان کی قانونی تاریخ (جلد اول، دوم)	262.00	66.00
20	ہندوستان میں چھاپہ خانہ	52.00	13.00
21	ہندوستانی سیاسی نظام کا تدریجی ارتقا	95.00	24.00
22	ہندوستانی معیشت	134.00	34.00
23	ہندوستانی مصوری عہدِ مغلیہ میں	158.00	40.00
24	ہندوستانی مصوری: ایک خاکہ	130.00	33.00
25	حیدرآباد کے اردو روزناموں کی ادبی خدمات	92.00	23.00
26	ابتدائی علمِ شہریت	47.00	12.00
27	انسانی ارتقا	70.00	18.00
28	انتظامی قانون کے اصول	120.00	30.00

29	جامع انگریزی اردو ڈکشنری (جلد۔6-1)	3400.00	850.00
30	جامع اردو انسائیکلو پیڈیا (جلد۔4-1 اور 8-6)	1790.00	448.00
31	جنت سنگار	180.00	45.00
32	کلیات پریم چند (جلد 1 تا24)	4071	1018.00
33	للو لال جی ایک ادبی سوانح	72.00	18.00
34	لغت ابجد شماری (جلد۔1، حصہ دوم) لغت ابجد شماری (جلد۔2، حصہ اول و دوم)	387.00	97.00
35	مجموعۂ نغز	268.00	67.00
36	مسدود راہیں	126.00	32.00
37	مثنوی بہرام وگل اندام	66.00	17.00
38	مولیئر	57.00	14.00
39	مسلم ہندوستان کا زراعتی نظام	92.00	23.00
40	اڑیسہ میں اردو	157.00	39.00
41	پشکن	60.00	15.00
42	قدیم ہندی فلسفہ	82.00	21.00
43	قدیم ہندوستان میں شودر	82.00	21.00
44	قومی زبان	76.00	19.00
45	قواعد کیٹلاگ سازی	268.00	67.00
46	صنعتی تنظیم اور انتظام	149.00	37.00
47	سیرِ کہسار	167.00	42.00
48	طبیعیات کے بنیادی تصورات	82.00	21.00
49	تمل ناڈو میں اردو	135.00	34.00
50	تنقید عقل محض	158.00	40.00
51	تاریخ طبعی (جلد۔1)	43.00	11.00
52	تاریخ فلسفہ سیاسیات	97.00	24.00
53	تشریحی تصاویر	66.00	17.00
54	توضیحی لسانیات	136.00	34.00
55	تذکرۂ مخطوطات (جلد۔5-1)	431.00	108.00
56	تالستائے	46.00	11.00
57	اصولِ معاشیات	47.00	12.00
58	اتر پردیش کے لوک گیت	120.00	30.00
59	وجے نگر کے عہد میں نظامِ حکومت	118.00	30.00
60	وادیٔ سندھ اور اس کے بعد کی تہذیبیں	45.00	11.00
61	وضاحتی کتابیات (جلد 1،3-22)	2650.00	663.00

62	زراعتی انکشافات	192.00	48.00
63	آسان اردو شارٹ ہینڈ	92.00	23.00
64	عکس اور برعکس	128.00	32.00
65	امریکی ادب کا مختصر جائزہ	52.00	13.00
66	بھارت 2004	250.00	63.00
67	دھوپ چولھا	38.00	10.00
68	اجارہ	131.00	33.00
69	فسانۂ آزاد جلد 1 تا 4	1163.00	291.00
70	ہندوستانی سرزمین اور عوام	30.00	08.00
71	ہندوستان کا صنعتی ارتقا	130.00	33.00
72	ہندوستان میں بیوپاری کارپوریشن	188.00	47.00
73	ابتدائی سماجیات	43.00	11.00
74	ارتقائے کائنات انسان ودیگر مضامین	94.00	24.00
75	جدید ابتدائی منطق	57.00	14.00
76	جان کمپنی سے جمہوریہ تک	114.00	29.00
77	کائنات جلیل	80.00	20.00
78	کتب خانہ داری ایک تعارف	108.00	27.00
79	معاشیات کے بنیادی اصول	82.00	21.00
80	مسلمانوں کے سیاسی افکار اور ان کا انتظام حکومت	82.00	21.00
81	پیمائش ونقشہ کشی	85.00	21.00
82	قدیم ہندوستان کی تاریخ	114.00	29.00
83	قدیم تامل ناڈو میں عربی وفارسی	98.00	25.00
84	سفرنامہ فرہنگ مسیر طالبی	73.00	18.00
85	شہیدان آزادی (جلد اول ودوم)	213.00	53.00
86	شخصیت کے نظریات	92.00	23.00
87	شماریات اور کاروبار میں ان کا استعمال	150.00	38.00
88	سخنوران گجرات	77.00	19.00
89	تاریخ ہندی فلسفہ (جلد اول)	89.00	22.00
90	تاریخ آصفی	58.00	15.00
91	اجرتیں	95.00	24.00
92	جدید ہندوستان کے سماجی وسیاسی افکار	178.00	45.00
93	جنوبی ہند کی تاریخ	114.00	29.00

یہ رعایت 31 مارچ 2009 تک دی جائے گی۔

نوٹ:۔ محصول ڈاک اور محصول مال برداری (Transportation) خریدار کے ذمے ہوگا، کتابوں کی قیمت پیشگی روانہ کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-8، آر.کے. پورم، نئی دہلی-110066

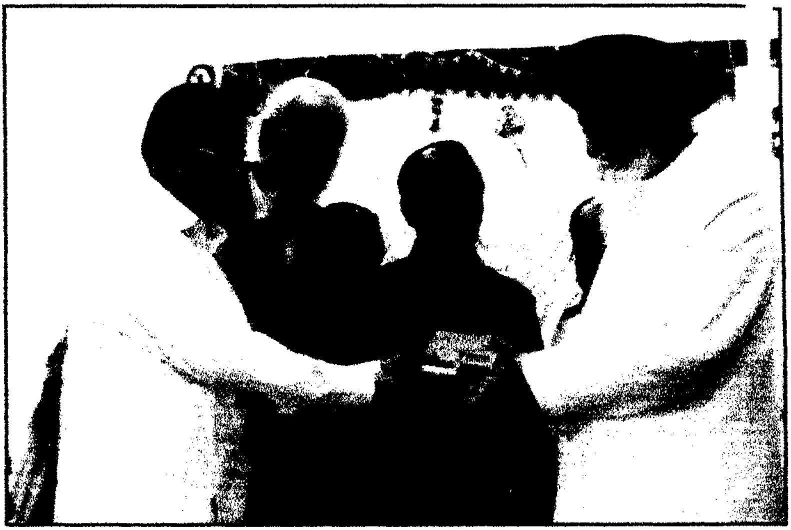

تملناڈو کے گورنر محترم مسٹر جیت سنگھ برنالا، کرشناگری میں منعقدہ اردو کانفرنس میں جناب اشفاق الرحمٰن مظہر کے مجموعۂ کلام "سیاہ و سفید" کا اجرا کرتے ہوئے۔
تصویر گورنر صاحب کے علاوہ جناب مختار بدری، جناب اشفاق الرحمٰن مظہر اور جناب سعید احمد دیکھے جاسکتے ہیں۔

گذشتہ دنوں لکھنؤ میں ہندی اردو ایوارڈ کمیٹی کی جانب سے ملک کے نامور ادیبوں اور صحافیوں کو ان کی خدمات کے اعتراف میں ایوارڈ پیش کیے گئے۔ تصویر میں (دائیں سے)
سید ظفر علی نقوی، قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین جناب چندر بھان خیال، پروفیسر گوپی چند نارنگ، جناب گلزار، ملک زادہ منظور احمد اور جناب شاہین مقیم کناڈا۔ تفصیل "اردو خبر نامہ" میں دیکھیں۔

Date of Publication : 24/03/2009
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

URDU DUNIYA Monthly, April 2009, Vol. 11, Issue: 4
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India

سراج اورنگ آبادی

مرتب: عبدالقادر سروری

سراج اورنگ آبادی دکن کا وہ آخری بڑا شاعر ہے جس کی شاعری دکن اور شمال کی زبان کے بیچ احساس دوئی کو ختم کرتی ہے۔ انھوں نے چوبیس سال تک کے شعری سفر میں جو کچھ کہا ان میں سے دستیاب شدہ 508 غزلیں، 11 مثنویاں، 9 رباعیاں، ایک قصیدہ، 5 مستزاد، ایک ترجیع بند اور ایک مناجات اس کلیات میں شامل ہیں۔ اردو شعر وادب میں سراج کی قادر الکلامی مسلم ہے، ان کے کلام کا انتخاب اردو دنیا کی تقریباً تمام درس گاہوں کے نصابات میں شامل ہے۔ اس غرض سے قومی اردو کونسل نے "کلیات سراج" کو نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔

صفحات: 732، قیمت: -/138 روپے

سعادت حسن منٹو

مرتب: پروفیسر شمس الحق عثمانی

سعادت حسن منٹو بیسویں صدی کے سب سے زیادہ پڑھے جانے والے اردو ادیبوں میں سے ہیں۔ کونسل نے ایک بڑے منصوبے کے تحت ان کی تمام تحریریں جن میں افسانے، ریڈیو ڈرامے، فیچر، مضامین، خاکے وغیرہ شامل ہیں، شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ پہلی جلد میں "آتش پارے"، "منٹو کے افسانے" اور "دھواں" کے افسانے شامل ہیں۔ ساتھ میں اشاریہ بھی دیا گیا ہے۔

صفحات: 565، قیمت: -/285 روپے

دکنی لغت

مرتب: سیدہ جعفر

دکنی شعر وادب کی تفہیم، ہماری ادب فہمی کا ایک اہم پہلو ہے۔ پروفیسر سیدہ جعفر نے، جو اردو زبان وادب کی تاریخ پر عبور رکھنے کے ساتھ ساتھ دکنیات کا بھی پاکیزہ ذوق رکھتی ہیں، اس لغت کی تدوین وترتیب میں دکنی الفاظ، محاورات، ضرب الامثال، روزمرہ، تکیہ کلام اور ان کے معانی کی مختلف جہات کا احاطہ کیا ہے۔ ساڑھے پانچ سو برس قدیم ان دکنی الفاظ کا صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھنا اس لیے ناگزیر ہے کہ زیر اور زبر سے معنی میں بہت تبدیلی آ جاتی ہے۔ طلبہ و اساتذہ کی اسی ضرورت اور سہولت کے پیش نظر قومی اردو کونسل نے حال ہی میں یہ لغت شائع کی ہے۔

صفحات: 521، قیمت: -/590 روپے

آزادی کے بعد اردو نظم (1)

مرتبین ـــــ شمیم حنفی، مظہر مہدی

"آزادی کے بعد اردو نظم" آزادی کے بعد کی اردو نظموں کا ایک جامع انتخاب ہے جس میں 67 نمائندہ نظم نگاروں کی 245 نظمیں شامل ہیں۔ تمام نظمیں اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخط میں پیش کی گئی ہیں اور فٹ نوٹ میں مشکل الفاظ وتراکیب کے معنی بھی دیے گئے ہیں جن سے ہندی اردو کے قارئین ایک ساتھ استفادہ کر سکتے ہیں۔

صفحات: 758، قیمت: -/384 روپے

ہندی اردو لغت

مرتب: پروفیسر نصیر احمد خاں

ٹیکنک اور ترتیب وتقسیم کے اعتبار سے "جدید ـــــ ہندی اردو لغت" اپنی نوعیت کی واحد لغت ہے جس میں قدیم وجدید ہندی کے الفاظ، ان کے تلفظات، مآخذ اور نحوی زمروں کے علاوہ معنی ومفہوم کو اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخطوں میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ماہر لسانیات پروفیسر نصیر احمد خاں کی مرتب کردہ یہ لغت ایک مفید، کارآمد اور سنجیدہ کاوش ہے جو اردو اور ہندی کے طلبہ کی بیشتر ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔

صفحات: 3286 (دونوں جلدیں)، قیمت -/1640 روپے (دونوں جلدیں)

آبشار اور آتش فشاں

مصنف: فضیل جعفری

فضیل جعفری ہمارے عہد کے معتبر ناقد اور ممتاز شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ "آبشار اور آتش فشاں" ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں 11 مضامین شامل ہیں۔ ان کی یہ تنقیدی تحریریں ادب پاروں پر نہیں بلکہ اپنے عہد کی تنقیدوں اور نقادوں پر ہیں۔ اردو ادب کی تنقیدی تاریخ میں ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت پر بہت بحثیں ہوئی ہیں اور تائید وتردید میں مزید تشخیص اور دلائل کا سلسلہ جاری ہے۔ اس بحث کی تفہیم میں فضیل جعفری کی یہ کتاب قاری کے ذہن کو نئی روشنی عطا کرتی ہے۔

صفحات: 368، قیمت: -/160 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دھلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ھے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ھے۔ ادارہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

Printed and Published by Dr. Abu Bakar Abbad, PPO, NCPUL on behalf of NCPUL West Block-1, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110066, and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 on 70 GSM Paper produced by TNPL Editor: Dr. Abu Bakar Abbad, Tel: 26103381, 26103938